حضرت موسیٰ نیشنلسٹ لیڈر تھے
یا
نبی اور رسول؟

ہمارے ایک رفیق نے کسی عالم دین کی ایک تحریر یا تقریر کے کچھ اقتباسات ہم کو بھیجے ہیں اور ان پر چند سوالات کیے ہیں۔ یہ اقتباسات اور سوالات یہاں نقل کرکے ہم ان پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ اقتباسات یہ ہیں:-

"بنی اسرائیل کو فرعون اور قبطیوں کی غلامی کرتے ہوئے جب ایک مدت گذر گئی تو رحمت خداوندی جوش میں آئی اور موسیٰ علیہ السلام کی ذات بابرکات کو یہ غلامی شکن حکم ملا کہ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (فرعون کے پاس جاؤ، وہ حد سے نکل گیا ہے) اس کے "حد سے نکل جانے" کی سب سے بڑی صورت یہ تھی کہ اس نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا تھا"

"ادھر جبکہ بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلانے ہی کے لیے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس بھیجا گیا یعنی ان کی بعثت کی اولین غرض ہی یہ تھی کہ فرعون کے پاس جاکر کہو ان اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (کہ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے اور غلامی کے عذاب سے نجات دے) تو آیت سے صراحتاً یہی واضح ہوا کہ غلامی سے استخلاص اور اس کے لیے جدوجہد ایک مذہبی فریضہ ہے، جس کے لیے مستقلاً ایک جلیل القدر پیغمبر کی بعثت عمل میں آئی۔ کیا اس آیت کی رو سے ہمارے لیے استخلاص اور تحصیل آزادی کی جدوجہد تقریباً ضروری، اور ایک دینی وظیفہ نہیں ٹھیرتی؟"

"ساتھ ہی یہ چیز بھی نمایاں ہو گئی کہ مسلمانوں کے لیے بنیادی مسئلہ نہ رفع جہالت کا ہے، نہ اقتصادیات کا، نہ اپنے اور ابنائے وطن کے تعلقات کا، نہ منصبی اور عرفی حیثیت کا، بلکہ اصل مسئلہ ان سب مصائب کی بنیاد کو اکھاڑ پھینکنے کا ہے اور وہ غلامی ہے جس کا ایک سرا ہندوستان کے گلے میں پڑا ہوا ہے اور دوسرا پوری دنیائے اسلام کے گلے میں ہے۔"

"اسی لیے موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے لیے نہ اولاً تورات اترنے کی دعا کی جس سے ان کا تعلیمی مسئلہ متعلق تھا، نہ ان کی اقتصادی حالت کی جانب کچھ زیادہ "توجہ فرمائی" جس سے مالی حالت درست ہوتی اور نہ اور ہی امور کی طرف "زیادہ" التفات فرمایا جن سے حیثیت و عزت کو تعلق تھا بلکہ سب سے اول ان مفاسد کے سرچشمے (غلامی) کی جڑ پر تیشہ لگایا اور فرعون کو خطاب کیا کہ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ تاکہ یہ "آزادانہ" زندگی بسر کر سکیں اور اپنی "مذہبی اور سیاسی تعمیر باختیار خود" کرنے پر قادر ہو جائیں۔"

"پس آج بھی ہندوستانیوں کے لیے بنیادی مسئلہ آزادی ہند اور آزادی دنیائے اسلام کا ہے جو آزادی ہند ہی سے متعلق ہے......پس مسلمانوں کے لیے حصول آزادی کی جدوجہد کوئی رسمی سیاست نہیں بلکہ ایک مذہبی فریضہ ہے جس کے لیے انھیں اپنی پوری اجتماعی قوت صرف کرنے کی ضرورت ہے۔"

مذکورہ بالا اقتباسات پیش کر کے ہمارے بھائی نے ہم سے مندرجہ ذیل سوالات کیے ہیں:-

"کیا موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کی اولین غرض بنی اسرائیل کو آزاد کرانا تھا؟ کیا تمام انبیاء علیہم السلام کی بعثت کی غرض یہ نہیں ہے؟ اگر موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کی غرض آزادیٔ بنی اسرائیل تھی جیسا کہ مولانا نے فَأْتِيَاهُ فَقُولَا إِنَّا رَسُولَا رَبِّكَ فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ (اس کے پاس جاؤ اور کہو کہ ہم تیرے رب کے رسول ہیں پس ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دے) سے استدلال کیا ہے تو پھر ظاہر ہے کہ سب سے زیادہ اہم بات آزادی کی جدوجہد ثابت ہوئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے لیے رفع جہالت کا مسئلہ کوئی بنیادی مسئلہ نہیں ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ آپ نے اس سے مختلف راستہ اختیار کیا؟ آپ بھی آزادی کی جدوجہد میں، دوسرے علمائے کرام کی طرح، کیوں نہیں لگ جاتے؟ آخر آپ ایک بنیادی مسئلہ کو چھوڑ کر ایک غیر ضروری، ضمنی اور بالکل ہی غیر بنیادی مسئلہ (رفع جہالت مسلمین) میں اپنی اور اپنے رفقا کی قوت و قابلیت کیوں صرف فرماتے ہیں؟ اور اگر ان پیدا شدہ سوالات کی بنیاد آپ کے نزدیک غلط ہے تو پھر ضروری ہے کہ اس معروضہ پر پوری تفصیل کے ساتھ کلام فرمائیے۔ ایک طرف ایک عالم دین کی شخصیت ہے جو علم و تقویٰ میں کل ہند شہرت رکھتی ہے دوسری طرف اس کے یہ ارشادات ہیں جن کے نتائج سے دل لرزتا ہے۔ ہمیں بتائیے کہ کیا موسیٰ علیہ السلام فی الواقع کوئی "نیشنلسٹ لیڈر" تھے یا "نبی اور رسول" تھے؟

ہمارے یہی بھائی ایک دوسرے گرامی نامہ میں ایک اور سوال دریافت فرماتے ہیں جو اسی سلسلہ سے تعلق رکھتا ہے بلکہ اس سے اوپر کی غلط فہمیوں کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے اس وجہ سے ہم اسے بھی یہیں درج کیے دیتے ہیں تاکہ اسی ضمن میں اس کا بھی جواب ہو جائے۔ وہ فرماتے ہیں:-

"۱- قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب بنی اسرائیل میں مبعوث ہوئے تو اس وقت بنی اسرائیل ان ہی حالات میں گرفتار تھے جن میں آج ہندی مسلمان گرفتار ہیں لیکن حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم کی اخلاقی تربیت پر زیادہ زور نہیں دیا اور اگر دیا بھی تو انھوں نے اپنی قوم کے صالحین کو چھانٹ کر الگ ایک جتھا نہیں بنایا یہاں تک کہ جب وہ نکلے ہیں تو کوئی بھی اسرائیلی پیچھے نہیں رہا۔

۲- صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر میں باب کے خاتمہ کے قریب ایک حدیث آئی ہے کہ جب آپ بدر کی مہم پر روانہ ہوئے تو راستہ میں ایک بہادر جری آدمی ملا اور اس نے کہا "جئت لاتبعك واصيب معك" لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے "ایمان باللہ والرسول" سے متعلق پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ مسلم نہیں ہے اس پر آپ نے فرمایا "ارجع فلن استعين بمشرك"۔ اسی طرح کئی بار سوال و جواب ہوا بالآخر اس نے ایمان باللہ والرسول کا اقرار کیا تو اسے "مومن" کی حیثیت سے "جہاد" میں شرکت کی اجازت دی اور وہ مجاہدین کے ساتھ چل پڑا۔

نمبر اول سے معلوم ہوتا ہے کہ دور غلامی میں کچھ بہت زیادہ کچے اور پکے لوگوں کو چھانٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف اتنا کافی ہے کہ وہ جس درجہ پر بھی ایمان کے مدعی ہوں انھیں لے کر آزادی کے حصول کی کوشش شروع کر دی جائے پھر آزاد ہونے کے بعد تزکیہ وغیرہ کا کام شروع کیا جائے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کیا۔

نمبر ۲ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پرانے مسلمان تو خیر پرانے ہیں جو آج ہی ایمان لائے ہوں اور تطہیر و تزکیہ ان کا بالکل نہ ہوا ہو

انھیں بھی بغیر کسی تیاری کے جہاد میں شریک کیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر جماعت اسلامی اپنے اس ابتدائی مرحلہ پر کن وجوہ سے کاٹ چھانٹ کرتی ہے؟ ہندوستان کے مسلمان بنی اسرائیل سے اور اس نو مسلم سے زیادہ بگڑے ہوئے تو نہیں ہیں؟"

تین غلط فہمیاں یہ سارا استدلال درحقیقت تین غلط فہمیوں پر مبنی ہے:-

۱- پہلی غلط فہمی یہ ہے کہ یہ حضرات سمجھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مطالبہ فرعون اور اس کی قوم سے صرف یہ تھا کہ وہ بنی اسرائیل کو آزاد کر دے۔ ان بزرگوں کے خیال میں حضرت موسیٰ علیہ السلام یا تو فرعون اور اس کی قوم کی طرف بحیثیت رسول سرے سے بھیجے ہی نہیں گئے تھے، یا بھیجے گئے تھے تو قاعدے کے تمام رسولوں کے طریقہ کے خلاف، فرعون اور اس کی قوم کے لیے ان پر یہ ذمہ داری نہیں ڈالی گئی تھی کہ ان کو ایمان باللہ، ایمان بالرسول اور ایمان بالآخرت کی دعوت دیں، ان پر اللہ کی حجت تمام کریں، ان کو خدا سے ڈرائیں اور تذکیر و تبلیغ کا وہ فرض انجام دیں جو ہر نبی اور رسول ان لوگوں کے اندر انجام دیتا ہے جن کی طرف وہ بھیجا جاتا ہے۔ یہ ساری ذمہ داریاں ان کے اوپر صرف بنی اسرائیل کے لیے تھیں۔ فرعون اور اس کی قوم کی ہدایت و ضلالت سے ان کو کوئی سروکار نہ تھا۔ فرعون سے ان کا معاملہ صرف یہ تھا کہ اپنی قوم کو اس کی غلامی سے چھڑا لیں۔ بس اسی کام پر اللہ تعالیٰ نے ان کو مامور کیا تھا چنانچہ جاتے ہی انھوں نے یہ مطالبہ فرعون کے سامنے پیش کر دیا اور اسی طرح پیش کر دیا جس طرح کانگریس نے "ہندوستان کو خالی کردو" (Quit India) کا رزولیوشن پاس کر دیا۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ کانگریس نے یہ تجویز نصف صدی سے زیادہ کی جد و جہد کے بعد پاس کرنے کی جرأت کی لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ خدا کی طرف سے صرف بنی اسرائیل کو آزادی ہی دلانے کے لیے رسول بنا کر بھیجے گئے تھے اس وجہ سے بے خوف و خطر انھوں نے اپنا مطالبہ، پہلی ہی ملاقات میں، فرعون اور اس کی قوم کے سامنے رکھ دیا۔ اور ان کو یہ یقین دلانے کے لیے، کہ وہ بنی اسرائیل کی آزادی کی مہم پر خدا کی طرف سے بھیجے گئے ہیں انھوں نے متعدد معجزات دکھائے لیکن یہ لوگ، ان معجزات کے بعد بھی، بنی اسرائیل کو غلام بنانے ہی پر اڑے رہے۔ بالآخر حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے روانہ ہو گئے اور فرعون اور اس کی ساری فوج ان کا تعاقب کرتے ہوئے بحر قلزم میں غرق ہو گئی۔

۲- دوسری غلط فہمی یہ ہے کہ یہ حضرات بنی اسرائیل کے اندر بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کو دو مختلف حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک دور ان کی مصر کی زندگی کا۔ دوسرا دور ان کے مصر سے نکلنے کے بعد کی زندگی کا۔ اور ان دونوں دوروں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کام بنی اسرائیل کے اندر، ان لوگوں کے نزدیک، دو بالکل مختلف نوعیتیں رکھتا ہے۔ پہلے دور میں ان کے نزدیک اصلی کام بنی اسرائیل کی آزادی کا تھا اور اسی پر انھوں نے اپنی ساری توجہ مرکوز کی۔ اس دور میں انھوں نے نہ ان کے عقائد و ایمانیات کا سوال چھیڑا اور نہ ان کی تربیت و تزکیہ کی طرف کچھ ایسی توجہ کی۔ صرف نسبی عصبیت کے نعرہ پر، جس طرح ایک نیشنلسٹ لیڈر کرتا ہے انھوں نے تمام بنی اسرائیل کے اندر آزادی کی ایک لگن پیدا کر دی اور ان کو اپنی قیادت پر جمع کر لیا۔ اس سے قطع نظر کہ کوئی شخص خدا کو مانتا ہے یا نہیں، آخرت پر اس کا ایمان ہے یا نہیں، ان کی رسالت پر اس کو عقیدہ ہے یا نہیں، ہر اسرائیلی ان کی فوج کا سپاہی اور ان کی جماعت کا ایک رکن تھا اور ان سب کو بلا فرق و تمیز وہ مصر سے لے کر نکلے۔ ان کے مومن و منافق اور کافر و فاسق میں انھوں نے کوئی امتیاز نہیں کیا۔ جب فرعون کی غلامی سے باہر نکل آئے، تب انھوں نے ان کی تربیت و تعلیم اور اصلاح و تزکیہ کی طرف توجہ فرمائی اور ان کو خدا اور اس کے قانون سے آشنا کیا۔ اس طرح

ان حضرات کے خیال میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کام، ان کی زندگی کے پہلے دور میں ایک نیشنلسٹ لیڈر کے کام سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ اور مصر میں انھوں نے فرعون سے جو لڑائی لڑی وہ شرک و توحید اور کفر و اسلام کی جنگ نہ تھی بلکہ قبطیت اور اسرائیلیت کی جنگ تھی۔ ایک قوم پرست لیڈر کو جس طرح اپنی قوم کی آزادی عزیز ہوتی ہے اسی طرح ان کو بھی اپنی قوم کی آزادی عزیز تھی جس طرح ہر شخص جو نسل و خون اور وطنیت و قومیت میں اس لیڈر کا شریک ہوتا ہے، ان کے مفاد کے لیے وہ سر دھڑ کی بازی لگاتا ہے اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی ہر اسرائیلی کی آزادی کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائی۔ اور جس طرح ایک نیشنلسٹ لیڈر اشتراک اور ہم جنسی کے ان بنیادی اصولوں کے سوا جن پر اس کی قوم کی قومیت قائم ہوتی ہے اور کسی چیز کو اہمیت نہیں دیتا اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی قبطیت اور اسرائیلیت کے اس معرکہ میں، اسرائیلیت کے سوا کسی چیز کو اہمیت نہیں دی۔

۳۔ تیسری غلط فہمی یہ ہے کہ ان بزرگوں کے نزدیک ساری برائیوں کی جڑ غلامی اور ساری خوبیوں اور برکتوں کا سرچشمہ آزادی ہے۔ غلامی سے، ان حضرات کے نزدیک، مراد یہ ہے کہ کوئی قوم جو نسل و خون، تہذیب و معاشرت اور جغرافیائی حدود کے اعتبار سے ایک علحدہ قوم گنی جاتی ہو وہ کسی ایسی قوم کی محکوم ہو جائے جو ان اعتبارات سے ایک علحدہ حیثیت رکھتی ہو۔ اور آزادی کا مفہوم، ان کے نزدیک، یہ ہے کہ اس طرح کے اجنبی اقتدار سے محکوم قوم آزاد ہو کر اپنی تعمیر باختیار خود کر سکے۔ یہ آزادی اور "اپنی تعمیر باختیار خود" کر سکنے کا حق ان کے نزدیک تمام بھلائیوں کی بنیاد ہے۔ جب تک کسی قوم کو یہ خود مختاری نہ حاصل ہو اس وقت تک وہ نیکی کی راہ میں ایک قدم بھی نہیں بڑھ سکتی۔ اس وجہ سے، ان کے نزدیک، یہ ضروری ہوا کہ اگر کوئی قوم غلام ہو تو اس کی اصلاح کے سلسلہ میں پہلا قدم یہ ہے کہ اس کو آزاد کیا جائے اور جب تک اس کو آزادی نہ حاصل ہو جائے اس وقت تک اس کی اصلاح و تربیت کے سارے کام ملتوی رکھے جائیں۔ ان حضرات کے نزدیک چونکہ یہ آزادی و خود مختاری تمام برکتوں کا سرچشمہ ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ اس مقصد کے لیے انبیاء مبعوث فرماتا ہے۔ اور یہیں سے یہ بات بھی نکلی کہ کسی غلام قوم کے لیڈروں کا سب سے بڑا، سب سے مقدس اور سب سے مقدم فرض اپنی قوم کو آزاد کرانا ہے۔

غلط فہمیوں کے تین سبب ان غلط فہمیوں پر تنقید کرنے سے پہلے، بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ ان میں مبتلا ہونے والے حضرات معمولی لوگ نہیں بلکہ عالی مقام بزرگان دین ہیں، ضروری ہے کہ ان کے پیدا ہونے کے اسباب کا بھی ذکر کر دیا جائے۔ ہمارے خیال میں ان کے پیدا ہونے کے بھی تین سبب ہیں۔

(الف) پہلا سبب یہ ہے کہ تورات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ساری جد و جہد جو انھوں نے مصر میں کی ہے، اصول و عقائد کی جنگ کے بجائے ایک قومی و نسلی نزاع کے رنگ میں پیش کی گئی ہے۔ جو شخص بھی تنقید کی گہری نظر کے بغیر اس کو پڑھے گا وہ اس کو ایک پیغمبر کی دعوتِ ایمان و اسلام سے زیادہ ایک نیشنلسٹ لیڈر کی تحریک آزادی سے زیادہ مشابہ پائے گا۔ اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ساری توجہ کا مرکزی نقطہ معلوم ہوتا ہے کہ "بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دو" ساری داستان میں یہ بات کہیں نہیں نمایاں ہوتی کہ حضرت موسیٰ فرعون اور اس کی قوم کو اللہ، روز آخرت اور اس کے بھیجے ہوئے ہادی پر دل سوزی کے ساتھ ایمان لانے کی دعوت دے رہے ہوں اور فرعون اور اس کی قوم سے کسی اصول ر

مسالک پر جنگ کر رہے ہوں جس پر ایمان لانے کے بعد اس نزاع کا خاتمہ ہو سکے۔ بلکہ ان کا اول و آخر مطالبہ صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ "ہمیں جانے دو"۔ اس سلسلہ میں اگر خدا کا ذکر آتا بھی ہے تو اس حیثیت سے نہیں کہ وہی اس بات کا حقدار ہے کہ سب اسی کی غلامی اور بندگی کریں اور اسی کے قانون کو مانیں بلکہ فرعون اور اس کی قوم کے ایک حریف دیوتا کی حیثیت سے آتا ہے کہ "خداوند خدا اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے کہ تو میرے لوگوں کو جانے دے"۔ اسی طرح بنی اسرائیل کا ذکر اگر آتا ہے تو اس حیثیت سے نہیں کہ وہ اللہ کی مخلوق اور آدم کی اولاد ہیں اور اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ ان کے ساتھ خدا کے بندوں کا سا معاملہ کیا جائے بلکہ اس طرح آتا ہے کہ "اسرائیل خدا کا پہلوٹھا ہے اور ساری دنیا کی قومیں اس کے پاؤں کے نیچے کی چوکی بنیں گی"۔ اسی طرح بنی اسرائیل کے اندر حضرت موسیٰ علیہ السلام اس طرح نظر نہیں آتے جس طرح ایک پیغمبر اپنی قوم میں شب و روز خدا کی بندگی اور اس کی اطاعت کی دعوت دیتا ہوا نظر آتا ہے۔ جو لوگ اس کی دعوت پر ایمان لاتے ہیں ان کی زندگیوں کو سنوارنے کی فکر میں اپنی جان گھلاتا ہے، اور جو لوگ اس سے بدکے ہوئے ہوتے ہیں ان کو ڈھونڈھنے اور مانوس کرنے میں لگا رہتا ہے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ساری جد و جہد بنی اسرائیل کو بحیثیت بنی اسرائیل منظم کرنے کے لیے ہے۔ اور اس تنظیم میں کافر و مومن، مخلص و منافق اور کھرے اور کھوٹے کا کوئی سوال نہیں ہے۔ صرف اسرائیلی اور غیر اسرائیلی کا سوال ہے۔

توریت میں خدا کے ایک پیغمبر اور اس کے کارناموں کی تاریخ کا ایک بالکل قومی جہاد آزادی کے رنگ میں رنگ جانا کچھ تعجب انگیز نہیں ہے۔ جو بنی اسرائیل خدا کے بندے اور اس کی مخلوق (بشر ممن خلق) ہونے کی جگہ اس خبط میں مبتلا ہو گئے تھے کہ وہ خدا کے محبوب اور اس کے لاڈلے ہیں، جو یہود ایمان باللہ اور اطاعت رسول کی جگہ اسرائیلیت کو نجات کی گارنٹی یقین کرنے لگے تھے۔ جو لوگ اپنے تئیں بندگی سے بالاتر اور خدا کی گرفت سے بالکل محفوظ سمجھتے تھے، ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنی ساری تاریخ کو ایمان و عقیدہ کی روشنی میں پیش کرنے کے بجائے نسلی اور قومی استحقاق کی روشنی میں پیش کریں۔ اس کے بغیر نہ وہ اپنے غرور کو تسلی دے سکتے تھے اور نہ اپنے ان تصورات (امانی) کے لیے کوئی وجہ جواز پیش کر سکتے تھے جن میں مبتلا ہو کر انھوں نے خدا کی ساری شریعت سے آزادی حاصل کر لی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنی پچھلی تاریخ کو قومی مفاخر کی ایک داستان کی شکل میں مرتب کر کے اپنے ماضی اور حال میں ایک ربط پیدا کر لیا۔ اگرچہ یہ مصنوعی ربط پیدا کرنے میں وہ کامیاب نہ ہو سکے اور جگہ جگہ ایسا خلا چھوڑ گئے کہ قرآن نے ان کی تاریخ ہی کو ان کے باطل دعاوی اور ان کی لایعنی آرزوؤں کے خلاف سب سے بڑے گواہ کی حیثیت سے پیش کیا تاہم ان کو اتنی کامیابی تو ضرور ہوئی کہ ہمارے "کل ہند شہرت" رکھنے والے علماء، جن کے تقویٰ و تقدس کی قسمیں کھائی جاتی ہیں، قرآن کی تنبیہات کے باوجود ان کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کے شکار ہو گئے۔

(ب) غلط فہمی کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن نے اگرچہ بنی اسرائیل کی تاریخ صحیح نقطۂ نظر سے پیش کر دی ہے، جس سے یہود کی ساری غلطیاں بے نقاب ہو جاتی ہیں لیکن قرآن میں اسی سلسلہ کی دو مشکلیں ایسی ہیں جن کو ہر شخص آسانی سے حل نہیں کر سکتا۔ پہلی مشکل یہ ہے کہ قرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون و بنی اسرائیل کی پوری سرگذشت کسی ایک جگہ نہیں بیان ہوئی ہے۔ مختلف سورتوں میں اس سرگذشت کے مختلف ٹکڑے، سورہ کے موضوع و مضمون کے اعتبار سے آئے ہیں۔ اس وجہ سے اگر کوئی شخص اس پوری سرگذشت اور اس کے مختلف ادوار کو متعین کر کے ایک فریم میں لانا چاہے تو اس کو ذرا محنت کرنی پڑے گی

جس کو قرآن کا کوئی محنتی طالب علم ہی کر سکتا ہے۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ دوسرے انبیاء اور ان کی سرگذشتوں میں سے قرآن نے اولاً اتنا ہی حصہ بیان کیا ہے جتنا موقع کلام اور حکمت بیان کے پہلو سے ضروری تھا، ثانیاً اس کو بھی ایسے ایجاز و اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اس کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے صبر اور ذہانت دونوں درکار ہے۔ اس وجہ سے جو لوگ جلد باز ہیں اور قرآن کی پوری بات سمجھنے کے بجائے یہ چاہتے ہیں کہ جلدی سے ان کے مدعا کے موافق کوئی بات ان کے ہاتھ لگ جائے وہ نہایت آسانی سے، غلط فہمیوں کے شکار ہو جاتے ہیں۔ یہی صورت حال ان حضرات کو بھی پیش آئی ہے جو اصل معنا بنی اسرائیل کے ایک ٹکڑے کو پڑھکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک "نشلسٹ لیڈر" بنا بیٹھے۔ اور یہ سمجھنے لگ گئے کہ "غلامی سے استخلاص اور اس کے لیے جد و جہد ایک مذہبی فریضہ ہے جس کے لیے مستقلاً ایک جلیل القدر پیغمبر کی بعثت عمل میں آئی۔"

(ج) غلط فہمی کی تیسری وجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں قومی اور وطنی آزادی کی یہ تحریک جس کی قیادت آج کانگریس کر رہی ہے اور جس کی نہایت بھونڈی نقل مسلم لیگ نے اڑائی ہے۔ قرآن و حدیث سے روشنی حاصل کر کے مسلمانوں نے نہیں شروع کی تھی۔ بلکہ سترہویں اور اٹھارویں صدی میں جس آزادی کا غلغلہ یورپ کے ملکوں میں بلند ہوا تھا بعینہ وہی چیز جدید تعلیم اور جدید مطالعہ تاریخ کے اثر سے ہمارے ملک کے غیر مسلموں میں پیدا ہوئی اور چونکہ اس طرح کی آزادی کے مقدس ترین فرض انسانی ہونے پر کافی لٹریچر تیار ہو چکا تھا اس وجہ سے نئی تعلیم کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں بھی یہ چیز پھیلی اور بعینہ انہی تصورات و مطالبات کے ساتھ پھیلی جن تصورات و مطالبات کے ساتھ اس کے مغربی موجدوں نے اس کو وضع کیا تھا۔ شروع شروع میں مسلمانوں کے اندر سے کچھ منچلے اور حوصلہ مند لوگ اس کی طرف بڑھے۔ بعد میں ہندوستان کے اندر اور ہندوستان سے باہر کچھ ایسے مسائل پیدا ہو گئے کہ علماء کا گروہ بھی آزادی وطن کی اس جد و جہد میں شریک ہو گیا اور جو حالات ان حضرات کو اس چیز کی طرف لائے وہ ایسے ہنگامہ خیز تھے کہ ان کے اندر نہ کسی کو اس بات پر غور کرنے کی مہلت ہی تھی کہ آزادی کا یہ مغربی تصور اور حصول آزادی کا یہ مغربی طریق کار اسلام سے کچھ مناسبت بھی رکھتا ہے یا نہیں اور نہ ان میں سے کسی بزرگ کے پاس وہ ضروری معلومات ہی تھیں جن کی روشنی میں وہ اس آزادی کا تجزیہ کر کے سمجھ سکتے کہ اس کے فلسفہ اور اس کے عمل میں فساد کے کتنے اجزاء ہیں اور صلاح کے کتنے ذرات ہیں۔ بس یہ نعرہ کہ "آزادی ہر قوم کا پیدائشی حق ہے۔" اور "ہندوستان کی آزادی ہی پر تمام عالم اسلامی کی آزادی منحصر ہے" ان حضرات کو اس میدان میں کھینچ لایا۔ بعد میں جب اس آزادی کا فلسفہ اور اس کے حصول کا طریق کار آہستہ آہستہ لوگوں کے سامنے آیا اور ہر مرحلہ میں انھیں یہ بات محسوس ہونے لگی کہ آزادی کا یہ تصور اور اس کے مطالبات اس تصور آزادی سے بالکل مختلف ہیں جو اسلام نے پیش کیا ہے اور قدم قدم پر وہ اس راستہ سے اپنے آپ کو ہٹا ہوا پانے لگے جو اللہ اور اس کے رسول نے کسی مخصوص قوم کی آزادی کے لیے نہیں بلکہ دنیا جہان کی آزادی کے لیے بتایا تھا تو انھیں اس بات کی فکر ہوئی کہ اپنے طرز عمل کو جائز ثابت کرنے کے لیے قرآن و حدیث سے کچھ دلیلیں فراہم کریں۔ اس طرح کی کوشش کا نتیجہ وہ استدلال ہے جس سے خدا کے ایک جلیل القدر پیغمبر کو ایک نیشلسٹ لیڈر کے درجہ تک گرا دیا گیا ہے اور جس کو پڑھکر انسان کے کبر نفس پر حیرت ہوتی ہے کہ جب خدا کی کتاب اس کی خواہشوں کا ساتھ نہیں دیتی تو وہ کس طرح توڑ مروڑ کر اس کو اپنی خواہشوں کے مطابق بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ پس یہ ساری غلطی درحقیقت نتیجہ ہے اس بات کا کہ ان حضرات نے آزادی کی اس جد و جہد میں اپنے آپ کو اللہ اور اس کے رسول

کی رہنمائی کے بغیر بالکل دوسرے محرکات کے تحت ڈال دیا اور اب کہ ایک غلط راہ کی بہت سی منزلیں طے کر چکنے کے بعد انھیں محسوس ہو رہا ہے کہ وہ بالکل ایک غلط راہ پر پڑ لیے ہیں تو بجائے اس کے کہ الٹے پاؤں واپس لوٹیں اس بات کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ کسی طرح قرآن و حدیث سے ان کی یہ غلط روی ہدایت ثابت ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی کوشش کا نتیجہ یہ تو نکلنے سے رہا کہ غلط فہمیاں دور ہوں۔ اس کا نتیجہ تو بس یہی ہو سکتا ہے کہ جتنا ہی یہ حضرات اپنی غلطی کو صحیح ثابت کرنے کے لیے زور لگائیں گے اتنا ہی حق سے یہ اور دور ہٹتے جائیں گے۔ ہاں اگر ان کے اندر یہ ہمت ہوتی کہ حق کی خاطر اپنی قیادت کے پندار کو مجروح کر سکتے تو ہمیں یقین ہے کہ اس غلط رنگ آمیزی کے باوجود جو علمائے یہود نے اپنی تاریخ پیش کرنے میں کی ہے، اور اس ایجاز کے باوجود جو قرآن مجید میں پایا جاتا ہے، بالکل پہلی نظر میں ان کے سامنے اصل حقیقت بالکل روشن ہو کر آجاتی۔

ایک نبی اور ایک نیشنلسٹ لیڈر کے بنیادی اختلافات

شاید ان حضرات نے کبھی سکون کے ساتھ اس مسئلہ پر غور نہیں فرمایا کہ ایک نبی کی دعوت اور ایک قوم پرست لیڈر کی تحریک میں ایسے بنیادی اختلافات ہیں کہ یہ دونوں چیزیں کبھی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ ایک نبی کے نزدیک تمام خرابیوں کی جڑ انسان کی خود مختاری اور آزادی ہے اور تمام بھلائیوں کا سرچشمہ اللہ کی بندگی اور تنہا اسی کی اطاعت ہے۔ اس کے بالکل برعکس ایک قوم پرست لیڈر ساری خرابیوں کی جڑ غلامی کو قرار دیتا ہے اور ساری ترقیوں کا منبع اپنی تعمیر باختیار خود کرنے کے حق کو سمجھتا ہے۔ ایک نبی کی قوم ایمان و اسلام کے اصولوں پر ایمان لانے سے بنتی ہے اور ایک قومی لیڈر کی قوم نسل و نسب اور وطنیت کے مادہ سے تعمیر ہوتی ہے۔ ایک نبی کی ساری لڑائی اصول و عقائد سے ہوتی ہے۔ جو عقائد اس کے عقائد کے خلاف ہوتے ہیں ان سے وہ جنگ کرتا ہے، خواہ وہ اس کی قوم کے اندر پائے جاتے ہوں یا کسی دوسری قوم کے اندر، اور جو لوگ اس کے اصولوں کو مان لیتے ہیں وہ ان سے اپنی جماعت بنا لیتا ہے، خواہ وہ اس کی قوم کے اندر سے آئے ہوں یا اس کے باہر سے۔ اس کے بالکل برعکس ایک قومی لیڈر کا سارا جھگڑا اس قوم سے ہوتا ہے جو نسل و نسب یا وطنیت اور رنگ میں اس سے مختلف ہے اور چونکہ یہ اختلاف بہر شکل باقی رہتا ہے اس وجہ سے اس کا اختلاف بھی بہر حال قائم رہتا ہے۔ ایک نبی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے وہ نظام پیش کرتا ہے جو تمام بنی آدم کے لیے یکساں مفید ہو اور ایک قومی لیڈر زندگی کے سارے نقشے اپنی قوم کے مفاد کو سامنے رکھ کر بناتا ہے۔ یہ بنیادی اختلافات اتنے اہم ہیں کہ اگر مذہب کی زبان میں ان کو تعبیر کیا جائے تو ایک کفر ہے، دوسرا ایمان، ایک توحید ہے دوسرا شرک۔ اس وجہ سے اس کا امکان بالکل نہیں ہے کہ ایک شخص نبی اور رسول بھی ہو اور قومی لیڈر بھی، یا ایک نبی اپنی زندگی کے کسی دور میں تو ایک قومی لیڈر کے اصولوں پر کام کرے اور دوسرے دور میں ایک نبی کے اصولوں پر۔ کیونکہ ایسا فرض کرنا درحقیقت اس بات کو فرض کرنا ہے کہ العیاذ باللہ ایک نبی اپنی ایک ہی زندگی کے اندر کفر و اسلام دونوں کے اصول جمع کرلے یا اپنی زندگی کے ایک دور میں تو وہ شرک کا داعی ہو اور دوسرے دور میں توحید کا۔ یہ باتیں اتنی واضح ہیں کہ کوئی صاحب فہم ایک لمحہ کے لیے بھی اس غلطی میں مبتلا نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص کو پیغمبر بھی مانے اور پھر اس کی طرف ایک قومی لیڈر کی خصوصیات بھی منسوب کر دے۔ لیکن بدقسمتی سے چونکہ بہت سے علمائے دین اس غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہیں اس وجہ سے ہم قرآن مجید کی روشنی میں یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام صرف نبی اور رسول تھے۔ اپنی بعثت کے شروع میں بھی اور بعثت کے آخر میں بھی، فرعون کے لیے بھی اور بنی اسرائیل کے لیے بھی، اور

اس واقعہ سے کہ ان کی قوم کسی اور قوم کی غلام تھی۔ ان کے پیغام اور ان کے کام میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوا۔ جو دعوت تمام انبیائے کرام نے اپنی اپنی قوموں کو دی وہی دعوت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو دی۔ جو نذارہ ہر پیغمبر نے اپنی قوم کے ارباب اقتدار و ملأ مستکبرین کو سنایا وہی نذارہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے ارباب اقتدار اور ملأ مستکبرین کو سنایا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ دوسرے انبیاء کی قوموں کے ارباب اقتدار ان کی اپنی قوم کے اندر ہی کے لوگ ہوتے تھے، بنی اسرائیل کے ارباب اقتدار ان کے باہر کے یعنی قبطی تھے لیکن اس اختلاف سے کوئی ایسا جوہری فرق نہیں واقع ہوتا کہ ایک نبی کے اصول دعوت میں فرق پیدا ہو جائے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو دعوت حق دی، ان سے مناظرے کیے، ان کو معجزے دکھائے، ان پر اللہ کی حجت تمام کی۔ یہاں تک کہ ان کے اندر سے کچھ اہل حق ایمان بھی لائے لیکن جیسا کہ ہر نبی کی قوم کے ارباب اقتدار کی اکثریت نے نبی کی تکذیب کی اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد کے ملأ مستکبرین نے بھی ان کی تکذیب کی اور پھر جس طرح ہر نبی نے اپنی طرف سے اتمام دعوت اور مستکبرین کی طرف سے تکذیب اور قتل کی دھمکی کے بعد ہجرت کی اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنے زمانہ کے مستکبرین کی طرف سے مایوس ہو جانے کے بعد ہجرت فرمائی اور جس طرح ہر نبی کے جھٹلانے والے، نبی کی ہجرت کے بعد، خدا کے عذاب میں گرفتار ہوئے اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعداء بھی ان کی ہجرت کے بعد گرفتار عذاب ہوئے۔ یہ ساری تفصیلات قرآن میں موجود ہیں ہر شخص قرآن کو پڑھ کر دیکھ سکتا ہے کہ اس امر واقعہ کی وجہ سے کہ حضرت موسیٰؑ کی قوم کسی دوسری قوم کی غلام تھی نہ نبی کے فرائض رسالت کی نوعیت میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی نہ انبیاء کے لیے اور ان کے جھٹلانے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے جو مقررہ قوانین ہیں ان میں سر مو کوئی فرق ہوا۔ ایک ہی ضابطہ جو آدم سے لے کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک جاری رہا وہی ہم یہاں بھی جاری دیکھتے ہیں۔ اور فرق ہو بھی کیا سکتا تھا؟ مستکبرین کی نسل بدل جانے سے ان کی ذہنیت میں تو کوئی تبدیلی ہوتی نہیں۔ قریش کے ارباب اقتدار ابوجہل اور ابولہب ہوں یا بنی اسرائیل کے ارباب اقتدار فرعون و ہامان دونوں ایک ہی بیماری میں مبتلا تھے پھر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک کے پاس تو اللہ کا رسول یہ دعوت لے کر آئے کہ ایمان لاؤ، اور عمل صالح اختیار کرو اور دوسرے کے پاس محض بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ۔ آخر مستکبرین اور مستضعفین کی نسل مختلف ہونے کی وجہ سے خدا کے انبیاء کا رویہ کیوں بدل جائے؟ کیا العیاذ باللہ انبیاء بھی نسل و نسب کی اسی عصبیت میں گرفتار ہوتے ہیں جس میں ہمارے ہندوستان کے برہمن گرفتار تھے کہ شودر کے کان میں وید کا کوئی کلمہ نہ پڑنے پائے اور کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون سے کوئی نسلی پرخاش تھی کہ اگر وہ اللہ پر ایمان بھی لاتا جب بھی وہ یہی چاہتے کہ اس کی قوم الگ اور ان کی قوم علیحدہ رہے؟

اسی طرح بنی اسرائیل کے لیے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت وہی تھی جو ہر نبی اپنی قوم کو دیتا ہے۔ یعنی ایمان باللہ، ایمان بالرسول اور ایمان بالآخرت کی دعوت۔ کسی دوسری قوم کے زیر اقتدار ہونے کی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہرگز نہیں کیا کہ ان کو نسلی عصبیت کے نعرے پر جمع کر کے پہلے فرعون سے آزادی حاصل کرنے کی دعوت دیں اور اس کام سے فارغ ہونے کے بعد ایمان و اسلام کا درس شروع کریں۔ ان کی مصر کی زندگی اور مصر سے نکلنے کے بعد کی زندگی میں جو کچھ فرق ہے وہ صرف اجمال و تفصیل کا ہے۔ یعنی مصر کی زندگی میں انھوں نے اپنی قوم کو صرف اصول دین کی تعلیم دی۔ عقائد میں سے اللہ، رسول اور آخرت پر ایمان کی۔ عبادات میں سے نماز اور قربانی کی۔ اخلاق و اعمال میں سے توکل، صبر، اور حق پر استقامت کی۔ اور

مصر سے نکلنے کے بعد ان سارے اصولوں کی تشریح فرمائی اور ان کے مطابق ان کی تربیت کی۔ یہ بعینہٖ اسی طرح کا تدریجی ارتقاء ہے جو ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قبل ہجرت اور بعد ہجرت کی دعوت میں پاتے ہیں۔ جس طرح آنحضرت صلعم کی مکی اور مدنی زندگی بالکل ہم آہنگ اور مربوط ہے، اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے دونوں دور بالکل ہم آہنگ اور مربوط ہیں۔ یہ ان کے اوپر نہایت بدترین تہمت ہے کہ وہ مصر میں تو نسل ونسب کے دعوائے جاہلیت کے علمبردار تھے، لیکن سینا میں آکر خدا کے داعی بن گئے۔ البتہ طبیعت میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر موسیٰ علیہ السلام محض قومیت کے نعرہ پر لوگوں کو جمع نہیں کر رہے تھے بلکہ ایمان واسلام کے اصولوں پر جمع کر رہے تھے تو آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ جب وہ مصر سے نکلے تو ان کی ساری قوم ان کے ساتھ تھی۔ لیکن اولاً تو یہ بیان تورات کا ہے جس کی نسبت ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ اس میں بنی اسرائیل کی ساری تاریخ نسلی استحقاق اور خاندانی فضیلت کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے۔ ثانیاً یہ امر بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ دنیا میں کسی نبی کی تکذیب بھی کمزوروں اور مظلوموں نے نہیں کی ہے۔ صرف قوم کے ارباب جاہ نے کی ہے۔ بنی اسرائیل من حیث القوم ارباب جاہ میں شامل نہیں تھے، بلکہ مستضعفین یعنی مظلوموں میں تھے۔ ان کے لیے کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں خدا کے اتنے عجائب اور اس کی قدرت کے اتنے کرشمے دیکھ کر بھی ایمان نہ لاتے درانحالیکہ ان کو ایمان سے پھیرنے والے ارباب اقتدار اپنے مظالم اور اپنی نسلی عصبیت واجنبیت کی وجہ سے اپنا اعتماد ان کے اندر بالکل کھو چکے ہوں۔ اور خوف کے سوا کوئی دوسری کشش بھی بنی اسرائیل کو ان کی طرف کھینچنے والی نہ ہو۔

حضرت موسیٰؑ کا مطالبہ فرعون اور اس کی قوم سے

یہ مدعا کا اجمالی بیان تھا۔ اب کسی قدر تفصیل سے اصل صورت حالات کو قرآن مجید کی روشنی میں ملاحظہ فرمائیے۔ اور پہلے یہ دیکھیے کہ فرعون اور اس کی قوم کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تعلق کی نوعیت کیا تھی؟ کیا وہ محض ایک نیشنلسٹ لیڈر کی حیثیت سے ان کے پاس محض یہ مقصد لے کر گئے تھے کہ ان کی غلامی سے اپنی قوم کو چھڑا لیں یا بحیثیت رسول کے اس حیثیت سے کہ ان کو خدا پر ایمان لانے، خدا سے ڈرنے اور اپنی زندگیوں کو پاک کرنے کی دعوت دیں؟

اس سلسلہ میں سب سے پہلی اصولی بات قرآن مجید نے یہ بتائی ہے:۔

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ	ہم نے تمہاری طرف بھیجا ہے ایک رسول تم پر گواہ بنا کر جس طرح
كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ۝ فَعَصٰى فِرْعَوْنُ	ہم نے بھیجا تھا ایک رسول فرعون کی طرف گواہ بنا کر تو فرعون نے اس رسول
الرَّسُوْلَ فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا۔ (۱۵، ۱۶ مزمل)	کی نافرمانی کی تو ہم نے اس کو سخت عذاب میں پکڑا

اس آیت میں مخاطب قریش ہیں۔ ان سے یہ بات کہی جا رہی ہے کہ جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول، دین حق کی دعوت دینے کے لیے بھیجا تھا، اسی طرح تمہاری طرف ایک رسول، اللہ کے دین کی دعوت کے لیے بھیجا ہے۔ فرعون نے اس رسول کی دعوت قبول نہ کی تو وہ عذاب میں پکڑا گیا، اسی طرح اگر تم اس رسول کی بات نہ سنو گے تو عذاب میں گرفتار ہوگے۔

اس سے چند باتیں بالکل صاف ہو گئیں۔ پہلی یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون اور اس کی قوم کے پاس اسی طرح رسول بنا کر بھیجے گئے تھے جس طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قریش کی طرف بھیجے گئے تھے۔ دوسری یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی فرعون اور اس کی قوم کی طرف اسی طرح شاہد یعنی اللہ کے دین کے داعی بنا کر بھیجے گئے تھے جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اہل عرب

کی طرف اللہ کے دین کے داعی بنا کر بھیجے گئے تھے۔ تیسری یہ کہ فرعون اور اس کی قوم کا جرم بھی بعینہٖ وہی ہے جو آنحضرت صلعم کی قوم کا تھا۔ یعنی جس طرح قریش نے اللہ کے رسول کی دعوت نہ مانی اسی طرح فرعون اور اس کی قوم نے بھی اللہ کے رسول کی بات نہ مانی۔

دوسری جگہ اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ بات بھی قرآن نے بیان کر دی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس ایمان، تزکیہ اور خشیت الٰہی کی دعوت دینے کے لیے بھیجے گئے تھے۔

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى. فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى (النازعات ۱۷-۱۹)

فرعون کے پاس جاؤ وہ سرکش ہو گیا ہے۔ اور اس سے کہو کیا تجھ میں کچھ رغبت ہے کہ تو پاکیزگی اختیار کرے اور میں تجھے تیرے رب کی راہ بتاؤں تو اس سے ڈرے۔

اس آیت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس اس لیے بھیجے گئے تھے کہ اس کے اندر اگر نیک اور پاکباز انسان بننے کا کچھ بھی داعیہ ہو تو اس کو پاکیزہ زندگی کا طریقہ بتائیں اور اگر خداشناسی کا کچھ میلان ہو تو اس کو خدا کی صفتوں اور اس کے حکموں کی تعلیم دیں تاکہ وہ خدا سے ڈرے۔ نیز اسی آیت سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ قرآن کی اصطلاح میں طغیان کا مطلب یہ ہے کہ آدمی میں خدا سے بے پروائی پیدا ہو جائے۔

یہی بات ایک اور مقام میں بیان ہوئی ہے۔ اور وہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ ہدایت بھی کی گئی ہے کہ نہایت نرمی اور دلجوئی کے ساتھ فرعون کو تبلیغ حق کی جائے تاکہ تذکر اور خشیت کی راہ اختیار کرنے میں اس کے لیے داعی کی طرف سے کوئی چیز مانع نہ ہو۔

اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ. اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى. فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى

تم اور تمہارے بھائی دونوں میری نشانیوں کو لے کر جاؤ اور میرا ذکر بلند کرنے میں ڈھیلے نہ پڑنا، فرعون کے پاس جاؤ وہ سرکش ہو گیا ہے، اور اس کو نرمی کے ساتھ تبلیغ کرو تاکہ وہ یاددہانی حاصل کرے یا ڈرے۔

اسی سلسلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام خود فرعون سے فرماتے ہیں:

قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى. اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى

ہم تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے ایک نشانی لے کر آئے ہیں اور سلامتی ہے اس کے لیے جو اللہ کے طریقہ کی پیروی کرے۔ ہمارے پاس یہ وحی آئی ہے کہ خدا کا عذاب اس پر آئے گا جو جھٹلائے گا اور منہ موڑے گا۔

"الہدیٰ" کے معنی اللہ کی ہدایت کے ہیں جیسا کہ فرمایا ہے (قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى) جس سے صاف واضح ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس صرف بنی اسرائیل کو آزاد کرانے کے لیے نہیں گئے تھے بلکہ اللہ کی ہدایت لے کر گئے تھے جس کو قبول کرنے کی صورت میں فرعون کے لیے اللہ کی رحمت تھی اور جس سے اعراض کرنے کی صورت میں اس کا قہر و عذاب۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اس کی قوم کے سامنے توحید و معاد پر تقریر بھی کی ہے۔

قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى. قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى. قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى. قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ لَا يَضِلُّ

اس نے پوچھا تمہارا رب کون ہے اے موسیٰ؟ جواب دیا ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو پہلے اس کی خلقت عطا فرمائی پھر اس کو ہدایت بخشی۔ پوچھا اگلی قوموں کا کیا حال ہے؟ جواب دیا ان کا حال میرے رب کے علم میں ہے ایک کتا

رَبِّي وَلَا يَنسَى ۔ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ مَهْدًا وَسَلَكَ لَكُمْ فِيهَا سُبُلًا وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّن نَّبَاتٍ شَتَّىٰ ۔ كُلُوا وَارْعَوْا أَنْعَامَكُمْ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّأُولِي النُّهَىٰ ۔ مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ (طٰہٰ)

میں بھٹکا ہوں نہ میرا رب بھٹکے گا نہ بھولے گا۔ جس نے تمہارے لیے زمین کو گہوارہ بنایا، اس میں تمہارے لیے راہیں نکالیں، اور آسمان سے پانی اتارا پس ہم نے پیدا کیں اس سے طرح طرح کی نباتات، کھاؤ اور چراؤ اپنے چوپایوں کو۔ بے شک اس کے اندر دلیلیں ہیں عقلمندوں کے لیے۔ اسی سے ہم نے تم کو پیدا کیا، اسی میں لوٹائیں گے اور پھر اسی سے دوبارہ پیدا کریں گے۔

. . . .

قرآن نے توحید پر بعض مناظرے بھی نقل کیے ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے درمیان ہوئے۔

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعَالَمِينَ ۔ قَالَ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا إِن كُنتُم مُّوقِنِينَ ۔ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهُ أَلَا تَسْتَمِعُونَ ۔ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ آبَائِكُمُ الْأَوَّلِينَ ۔ قَالَ إِنَّ رَسُولَكُمُ الَّذِي أُرْسِلَ إِلَيْكُمْ لَمَجْنُونٌ ۔ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا إِن كُنتُمْ تَعْقِلُونَ ۔ قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ إِلَٰهًا غَيْرِي لَأَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُونِينَ (شعراء)

فرعون نے پوچھا اور یہ رب العالمین کیا ہے؟ جواب دیا آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا رب۔ بشرطیکہ تم یقین کرو۔ اس نے اپنے درباریوں سے کہا، سنتے ہو؟ کہا تمہارا بھی رب اور تمہارے پچھلے بزرگوں کا بھی رب۔ کہا یہ رسول، جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے، یہ تو پاگل معلوم ہوتا ہے۔ اس نے کہا مشرق اور مغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا رب۔ بشرطیکہ تم سمجھو۔ بولا اگر تو نے میرے سوا کسی اور کو معبود بنایا تو میں تمہیں قید خانہ کے حوالہ کر دوں گا

فرعون کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ شکایت بھی تھی کہ یہ جس بات کی دعوت دے رہے ہیں ہم نے اپنے بزرگوں سے نہیں سنی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے جواب میں یہ فرماتے کہ میں تمہارے پاس اللہ کی ہدایت لے کر آیا ہوں۔ یہ بعینہٖ وہی شکایت ہے جو ہر نبی کی قوم نے اس کی دعوت کے متعلق کی ہے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جواب بھی بعینہٖ وہی ہے جو ہر نبی نے قوم کے اس اعتراض کے جواب میں دیا ہے۔

وَمَا سَمِعْنَا بِهَٰذَا فِي آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ ۔ وَقَالَ مُوسَىٰ رَبِّي أَعْلَمُ بِمَن جَاءَ بِالْهُدَىٰ مِنْ عِندِهِ وَمَن تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ۔ وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ مَا عَلِمْتُ لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرِي

اور ہم نے تو یہ بات (توحید) اپنے اگلوں میں نہیں سنی اور موسیٰ نے کہا میرا پروردگار خوب جانتا ہے کہ کون اس کے پاس سے ہدایت لے کر آیا ہے اور انجام کار کی کامیابی کس کو حاصل ہوگی۔ یقیناً ظالم فلاح نہیں پائیں گے۔ اور فرعون نے کہا اے لوگو میں تمہارے لیے اپنے سوا کسی معبود سے واقف نہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سارا جھگڑا فرعون سے بنی اسرائیل کی آزادی ہی کے لیے تھا تو فرعون کے اس اعتراض کا کیا مطلب کہ حضرت موسیٰ آباء و اجداد کے طریقہ کے خلاف ایک بدعت پھیلا رہے ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس جواب کا کیا موقع پیدا ہوا کہ میں اگرچہ اپنی دعوت کی تائید میں آباء و اجداد کے طریقہ کی سند نہیں رکھتا لیکن اللہ تعالیٰ کی سند رکھتا ہوں؟ اور پھر اس بات کی ضرورت کیا پیش آئی کہ فرعون اپنے تمام ارباب حل و عقد کو اس بات پر متنبہ کرے کہ میرے سوا کسی کو

الزام مانا؟

اس سے زیادہ واضح بات ایک یہ ہے کہ فرعون کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے جو سب سے بڑا اندیشہ تھا وہ یہ نہ تھا کہ بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ لے کر اٹھے ہیں بلکہ یہ تھا کہ یہ کہیں اس کی قوم کا دین نہ بدل دیں اور ملک میں اس کی خدائی کے خلاف بغاوت نہ برپا کر دیں۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ (المومن)

اور فرعون نے کہا مجھے چھوڑ دو میں موسیٰ کو قتل کیے دیتا ہوں اور وہ اپنی مدد کے لیے اپنے رب کو بلائے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ تمہارا دین نہ بدل دے یا ملک میں فساد برپا کر دے۔

اور فرعون کا یہ اندیشہ بالکل بجا تھا۔ قبطیوں کے اندر بہت سے لوگ کھلم کھلا حضرت موسیٰؑ پر ایمان لا چکے تھے جن میں سب سے زیادہ حق پرست اور جری وہ لوگ تھے جو اپنے سحر سے حضرت موسیٰؑ کے معجزات کا مقابلہ کرنے آئے تھے اور بالآخر حق کی طاقت سے مغلوب ہو کر سحر سے تائب ہوئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے اور بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو فرعون کے جبر و ظلم کی وجہ سے اپنے ایمان کو چھپاتے تھے۔ چنانچہ ان کے اندر سے ایک شخص نے اس وقت اپنے ایمان کا اعلان کیا جب اس کی قوم نے حضرت موسیٰ کے قتل کا ارادہ کیا ہے اور اس وقت اس نے فرعون اور اس کی قوم کے سامنے دعوت ایمان پر ایک تقریر کی ہے جو قرآن مجید میں نقل ہوئی ہے۔ اس تقریر کو پڑھ کر ہر شخص معلوم کر سکتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے درمیان اصلی کشمکش بنی اسرائیل کی آزادی کے لیے نہیں تھی بلکہ ایمان باللہ، ایمان بالرسول، ایمان بالآخرت کے لیے تھی۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ ساری چیزیں ٹھیک انہی دلائل اور انہی تفصیلات کے ساتھ فرعون اور اس کی قوم کے سامنے پیش کی تھیں جن دلائل و تفصیلات کے ساتھ ہر نبی نے اپنی قوم کے سامنے پیش کیں۔ اس پوری تقریر کو پڑھیے۔ یہ مرد حق، عین موقع کا گواہ بھی ہے اور آل فرعون میں سے بھی ہے۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی دعوت کو جس صورت میں پیش کرتا ہے وہ کتنی مختلف ہے اس صورت سے جس صورت میں ہمارے یہ بزرگان دین حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پیش کر رہے ہیں۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ ۝ وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنِّىْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ ۝ وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ڰ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗٓ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَاۗءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ۝ يٰقَوْمِ

اور فرعون نے کہا ہٹو میں موسیٰ کو قتل کر دوں اور وہ پکارے اپنے رب کو (اپنی مدد کے لیے) مجھے ڈر ہے کہ وہ تمہارے دین کو بدل دے یا ملک میں فساد برپا کر دے۔ اور موسیٰ نے کہا میں نے ہر متکبر سے، جو روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتا، اپنے اور تمہارے رب کی پناہ پکڑی۔ اور ایک مومن نے جو آل فرعون میں سے تھا اور اب تک اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا، کہا کیا تم ایک ایسے شخص کو قتل کرو گے جو یہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے اور حال یہ ہے کہ وہ تمہارے پاس تمہارے رب کی کھلی ہوئی نشانیاں لے کر آیا ہے؟ اور اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کے جھوٹ کا وبال اس پر آئے گا اور اگر سچا ہے تو بھی عذاب کی دھمکی تم کو سنا رہا ہے اس کا

لکم الملک الیوم ظاہرین فی الارض فمن ینصرنا من
باس اللہ ان جاءنا قال فرعون ما اریکم الا ما اری وما
اھدیکم الا سبیل الرشاد ۝ وقال الذی امن یقوم
انی اخاف علیکم مثل یوم الاحزاب ۝ مثل داب قوم
نوح وعاد وثمود والذین من بعدھم وما اللہ یرید
ظلما للعباد ۝ ویقوم انی اخاف علیکم یوم التناد ۝
یوم تولون مدبرین ما لکم من اللہ من عاصم ومن
یضلل اللہ فما لہ من ہاد ۝ ولقد جاءکم یوسف
من قبل بالبینت فما زلتم فی شک مما جاءکم بہ
حتی اذا ھلک قلتم لن یبعث اللہ من بعدہ رسولا
کذلک یضل اللہ من ھو مسرف مرتاب ۝ الذین
یجادلون فی ایت اللہ بغیر سلطن اتھم کبر
مقتا عند اللہ وعند الذین امنوا کذلک یطبع
اللہ علی کل قلب متکبر جبار ۝ وقال فرعون
یھامن ابن لی صرحا لعلی ابلغ الاسباب ۝
اسباب السموت فاطلع الی الہ موسی وانی
لاظنہ کاذبا وکذلک زین لفرعون سوء عملہ
وصد عن السبیل وما کید فرعون الا فی تباب ۝
وقال الذی امن یقوم اتبعون اھدکم سبیل الرشاد
یقوم انما ھذہ الحیوۃ الدنیا متاع وان الاخرۃ
ھی دار القرار ۝ من عمل سیئۃ فلا یجزی الا مثلہا
ومن عمل صالحا من ذکر او انثی وھو مومن فاولئک
یدخلون الجنۃ یرزقون فیہا بغیر حساب ۝ ویقوم
ما لی ادعوکم الی النجوۃ وتدعوننی الی النار ۝ تدعوننی
لاکفر باللہ واشرک بہ ما لیس لی بہ علم وانا
ادعوکم الی العزیز الغفار ۝ لا جرم انما تدعوننی
الیہ لیس لہ دعوۃ فی الدنیا ولا فی الاخرۃ وان

کوئی حصہ تم پر آ کے رہے گا۔ اللہ اس شخص کو کامیاب نہیں کرتا جو زیادتی
کرنے والا اور جھوٹا ہے۔ اے میری قوم کے لوگو! آج تم کو اختیار حاصل
ہے اور ملک میں غالب ہو (اس وجہ سے موسیٰ کو قتل کر سکتے ہو) لیکن
اللہ کے عذاب سے ہم کو کون بچا سکے گا اگر وہ آگیا؟ فرعون نے کہا میں
تم کو وہی مشورہ دے رہا ہوں (موسیٰ کے قتل کے بارہ میں) جو میرے نزدیک
صحیح ہے اور میں ٹھیک راستہ کی طرف تمھاری رہبری کر رہا ہوں۔ اور جو شخص
ایمان لایا تھا اس نے کہا اے میری قوم کے لوگو (اگر تم نے موسیٰ پر ہاتھ اٹھایا)
تو تم پر بھی ویسا ہی عذاب آئے گا جیسا کہ گزشتہ جماعتوں پر آیا۔ (اور وہی
حال ہوگا) جو نوح کی قوم اور عاد و ثمود اور ان لوگوں کا ہوا جو ان کے بعد
آئے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم نہیں چاہتا اور اے میری قوم کے لوگو
مجھے ڈر ہے کہ تم پر ایک پکار کا دن آئے گا جس دن تم پیٹھ پھیر کر بھاگو گے
اور تم کو اللہ کی گرفت سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا۔ اور جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے
تو اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔ اور اس سے پہلے یوسف تمھارے پاس
کھلی ہوئی دلیلیں لے کر آیا تو تم اس کی لائی ہوئی باتوں کے متعلق برابر شک میں
پڑے رہے یہاں تک کہ جب وہ مر گیا تو تم نے کہا اب اس کے بعد اللہ کوئی رسول
نہیں بھیجے گا۔ اسی طرح اللہ گمراہ کر دیتا ہے ان لوگوں کو جو زیادتی کرنے والے
اور شک میں پڑنے والے ہوتے ہیں۔ جو لوگ اللہ کی آیات کے بارہ میں بغیر کسی
دلیل کے جو ان کے پاس آئی ہو، ہٹ دھرمی کرتے ہیں، ان کا رویہ اللہ
اور اہل ایمان کے نزدیک نہایت مبغوض ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ مہر
کر دیتا ہے ہر متکبر اور سرکش کے دل پر۔ اور فرعون نے کہا اے ہامان میرے لیے
ایک محل بنوا کہ میں بلندیوں پر پہنچوں، آسمانوں کی بلندیوں پر، اور موسیٰ کے
رب کو دیکھوں۔ میں تو اس کو بالکل جھوٹا خیال کرتا ہوں۔ اسی طرح فرعون
کی نظروں میں اس کی بدعملی کھبا دی گئی اور وہ راہ حق سے روک دیا گیا
اور فرعون کی مکاری کو نابود ہی ہونا تھا۔ اور جو ایمان لایا تھا اس نے کہا
اے میری قوم کے لوگو میری پیروی کرو کہ میں تمھاری رہنمائی راہ حق کی طرف
کروں۔ اے میری قوم یہ دنیا کی زندگی تو چند روزہ ہے۔ ہمیشگی کا گھر تو
آخرت ہے۔ جس نے کوئی بدی کی تو صرف اس کے مانند بدلہ دیا جائے گا اور

مَرَدَّنَا إِلَى اللَّهِ وَأَنَّ الْمُسْرِفِينَ هُمْ أَصْحَابُ النَّارِ ○ فَسَتَذْكُرُونَ مَا أَقُولُ لَكُمْ وَأُفَوِّضُ أَمْرِي إِلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ ○ فَوَقَاهُ اللَّهُ سَيِّئَاتِ مَا مَكَرُوا وَحَاقَ بِآلِ فِرْعَوْنَ سُوءُ الْعَذَابِ ○ (المومن)

جس نے نیکی کمائی، خواہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو تو وہی لوگ جنت میں جائیں گے اور وہاں بے حساب روزی پائیں گے۔ اے میری قوم کے لوگو کیا بات ہے، میں تمھیں نجات کے راستہ کی طرف بلا رہا ہوں اور تم مجھے جہنم کی طرف پکار رہے ہو؟ تم مجھے دعوت دے رہے ہو کہ میں اللہ کا انکار کروں، اور اس کا کسی ایسی چیز کو ساجھی قرار دوں جس کے بارہ میں مجھے کوئی علم نہیں اور میں تم کو خدائے عزیز و غفار کی طرف دعوت دے رہا ہوں۔ بلاشبہ جس چیز کی طرف تم مجھے بلا رہے ہو اس کا بلاوا کہیں نہیں ہے۔ نہ دنیا میں نہ آخرت میں۔ ہمارا لوٹنا تو اللہ کی طرف ہوگا اور زیادتی کرنے والے جہنم میں ہوں گے۔ تو اس وقت تم یاد کرو گے جو کچھ میں کہتا ہوں اور میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ بے شک اللہ بندوں کا نگران حال ہے۔ پس اللہ نے اس کو ان کی تدبیروں کے شر سے بچایا اور آل فرعون کو برے عذاب نے گھیر لیا۔

یہ پوری تقریر جو عین فرعون کے دربار میں ہوئی ہے اور ایک ایسے شخص نے کی ہے جو آل فرعون میں سے ہے بار بار پڑھیے۔ اس میں بیچ بیچ میں فرعون کی طرف سے مداخلتیں بھی ہوئی ہیں۔ ان کو بھی پیش نظر رکھیے اور پھر غور کیجیے کہ کیا فی الواقع حضرت موسیٰ اور فرعون کی یہ ساری کشمکش بنی اسرائیل کی آزادی کے لیے تھی یا یہ کفر و ایمان، توحید و شرک اور حب دنیا اور ایمان بالآخرۃ کی وہی کشمکش ہے جو ہر نبی اور اس کی قوم کے مستکبرین کے درمیان برپا ہوتی رہی ہے؟ اس میں تو بنی اسرائیل کی آزادی و غلامی کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں آتا۔ نہ استغاثہ کی طرف سے نہ صفائی کی طرف سے۔ فرعون حضرت موسیٰ پر یہ الزام لگاتا ہے کہ یہ قوم کا (قبطیوں کا) دین بگاڑ رہے ہیں اور اس کی خدائی کے خلاف بغاوت برپا کر رہے ہیں اس وجہ سے مستحق ہیں کہ قتل کر دیے جائیں۔ یہ مرد حق اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ایک شخص کو محض اس جرم میں قتل کرنا کہ وہ صرف اللہ واحد کو اپنا رب مانتا ہے، کوئی انصاف کی بات نہیں ہے، درانحالیکہ اس کے پاس خدا کی نشانیاں بھی موجود ہیں۔ اگر یہ زیادتی کی گئی تو اس کا وبال پوری قوم پر آ کے رہے گا۔ فرعون کہتا ہے رائے صائب وہی ہے جو میں دے رہا ہوں۔ مرد مومن اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ اگر اس رائے پر عمل کیا گیا تو قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود اور دوسری معذب قوموں کے انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہیے۔ پھر یہ بھی واضح کر دیتے ہیں کہ موسیٰ ہمارے پاس اسی طرح کی دعوت حق لے کر آئے ہیں جیسی حضرت یوسف لے کر آئے تھے لیکن آپ لوگوں کا دل ان کی دعوت پر بھی نہیں جما اور پھر اپنے لیے کسی رسول کی بعثت کی طرف سے آپ لوگ بالکل نچنت ہو کے بیٹھ گئے اور اب اللہ کی آیات کے بارہ میں خواہ مخواہ کی ہٹ دھرمی سے کام لے رہے ہیں۔ پھر اس کے بعد اپنی پوری قوم کے سامنے آخرت پر، جنت و دوزخ پر، کفر و شرک پر نہایت موثر خطبہ دیتے ہیں اور لوگوں کو نجات کے راستہ کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ پھر آخر میں ان سے مایوس ہو کر اپنا معاملہ اللہ کے حوالہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بہت جلد میری نصیحتوں کو یاد کرو گے اور اپنی غلطی پر پچھتاؤ گے۔ اس کے بعد اس بات کا بھی ذکر آتا ہے کہ ان کی قوم نے ان کے قتل کی بھی تدبیریں کیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو بچایا اور اغلب ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ انھوں نے بھی ہجرت فرمائی۔

اگر یہ سارا جھگڑا بنی اسرائیل کی آزادی ہی کے لیے تھا اور کفر و ایمان اور شرک و توحید کے بجائے حاکم و محکوم محض اس بات کے لیے لڑ رہے تھے کہ محکوم قوم کو اپنی تعمیر باختیار خود کرنے کا حق ملنا چاہیے تو اس طرح کی آویزش کا نتیجہ یہ تو ہرگز نہیں ہو سکتا کہ

قبطیوں کے اندر ایسے ایسے کامل الایمان اور صدیق پیدا ہوں۔ اس طرح کی نزاع، جو دو قوموں میں محض سیاسی برتری کے لیے برپا ہو اور جو خالص نسلی فرق و امتیاز کے مطالبات پر قائم ہو، اس کا لازمی نتیجہ تو یہ ہونا تھا کہ ایک قوم دوسری قوم کی من حیث القوم دشمن ہو اور اس کے مذہب اور اس کی روایات سے نفرت کرے۔ اور اگر محض انسانی ہمدردی کے داعیہ کی وجہ سے کچھ افراد ایسے نکل بھی آئیں جن کو مظلوم کے مطالبات سے کچھ ہمدردی ہو جائے تو وہ ہمدردی زیادہ سے زیادہ اس نوعیت کی ہو سکتی ہے جس طرح کی ہمدردی بعض نیک مزاج انگریز ہندوستانیوں کے مطالبات کے ساتھ کرتے ہیں۔ لیکن یہ تو عجیب بات ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام قبطیوں سے لڑائی تو محض بنی اسرائیل کی سیاسی آزادی کے لیے لڑیں لیکن اس لڑائی کے نتیجے کے طور پر قبطیوں کے اندر اس طرح کے اہل الایمان پیدا ہوں جس طرح کے اہل الایمان آنحضرت صلعم کی دعوت سے قریش کے اندر پیدا ہوئے۔

اس سلسلہ کی آخری بات حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مصر سے ہجرت اور فرعون اور اس کی فوج کا غرق ہونا ہے۔ جس وقت فرعون موجوں کے گھیرے میں آجاتا ہے اس وقت بے تحاشا اس کی زبان سے وہ بات نکل جاتی ہے جس کی حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کو دعوت دے رہے تھے لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی انتہائی جد و جہد کے باوجود وہ اس کے ماننے پر اڑا رہا، یعنی اللہ کی توحید اور اس کی اطاعت کی دعوت۔

حَتّٰىٓ اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَاۗءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۔ آٰلْــٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ (یونس)

یہاں تک کہ جب وہ غرق ہونے لگا تو پکار اٹھا کہ میں ایمان لایا اس بات پر کہ نہیں ہے کوئی معبود مگر وہ جس پر ایمان لائے ہیں بنی اسرائیل اور میں اطاعت کرنے والوں میں ہوں۔ اب، حالانکہ تم نے اس سے پہلے نافرمانی کی اور تم فساد برپا کرنے والوں میں تھے۔

اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس ایمان و اسلام کی دعوت لے کر نہیں گئے تھے، صرف بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ لے کر گئے تھے تو اس کو آخری وقت میں ایمان و اسلام کے اقرار کے بجائے یہ کہنا تھا کہ "ہائے میری بدبختی، میں نے بنی اسرائیل کو رہا کیوں نہ کیا"۔ یہ ایمان و اسلام کا اقرار تو صاف اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ ساری کشمکش درحقیقت ایمان و اسلام کے لیے تھی نہ کہ بنی اسرائیل کی سیاسی آزادی کے لیے۔

ان تمام باتوں پر غور کیجیے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک قوم پرست لیڈر کی طرح فرعون اور اس کی قوم کے پاس اپنی قوم کی آزادی کے لیے نہیں بلکہ وہ دعوت لے کر گئے تھے جو حضرات انبیائے کرام ہمیشہ اپنی اپنی قوموں کے مستکبرین کے پاس لے کر گئے۔ یہ دعوت انھوں نے پیش کی۔ اس کے لیے انھوں نے مناظرے اور مجادلے کیے۔ معجزات دکھائے۔ اللہ تعالیٰ نے حجت تمام کی۔ یہاں تک کہ یہ حجت اس قدر واضح ہوئی کہ مستکبرین کے اندر سے جو لوگ نیک فطرت کے تھے انھوں نے بھی اس کو قبول کر لیا اور پھر پوری قوت کے ساتھ اس دعوت کو بلند کرنے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دیا۔ لیکن جب خود اپنے ضمیر کی آواز سن لینے کے بعد بھی فرعون اور اس کے مفسد ارکان و اعیان نہ صرف اپنے کفر و شرک ہی پر اڑے رہے بلکہ انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل کا بھی ارادہ کر لیا تو اللہ تعالیٰ کی اس سنت کے مطابق جو اس نے انبیاء کے لیے

مقرر کر رکھی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اہل ایمان کے ساتھ ہجرت فرمائی اور فرعون اور اس کی قوم پر خدا کا عذاب آگیا۔ اللہ تعالیٰ کی یہی سنت تمام انبیاء اور ان کے جھٹلانے والوں کے اندر جاری رہی ہے اور یہی ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے جھٹلانے والوں کے درمیان دیکھتے ہیں۔ دوسرے انبیاء اور ان میں اگر فرق ہے تو دعوت اور مقاصد دعوت میں نہیں ہے اور نہ دعوت کے مدارج و مراحل میں ہے۔ صرف اس بات میں فرق ہے کہ ان کی قوم کے مستکبرین و مترفین نسل کے لحاظ سے مختلف تھے اور دوسرے انبیاء کی قوموں کے مستکبرین خود انہی کے اندر کے تھے لیکن یہ کوئی ایسا جوہری فرق نہیں کہ اس کی وجہ سے نبی کی دعوت میں کوئی فرق پیدا ہو جائے۔ اور وہ اللہ کے رسول کی جگہ ایک نیشنلسٹ لیڈر کی پوزیشن اختیار کر لے۔

حضرت موسیٰؑ کا کام بنی اسرائیل کے اندر

اب اسی طرح اس سوال پر غور کیجیے کہ مصر کی زندگی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے اندر کیا کام کیا؟ کیا کفر و اسلام اور شرک و توحید کا سوال چھیڑے بغیر انھوں نے ہر اسرائیلی کو آزادی کے مطالبہ پر جمع کر لیا اور ان کے کافر و مومن میں کوئی فرق نہیں کیا یا تمام انبیاء کی طرح انھوں نے بھی اپنی قوم کو ایمان و اسلام کی دعوت دی اور جن لوگوں نے ان کی دعوت قبول کی انہی سے اپنی جماعت بنائی؟

اس سلسلہ میں سب سے پہلا حکم جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملا وہ یہ ہے:۔

وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ۝ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ	اور میں نے تم کو انتخاب کیا تو سنو وہ بات جو تم پر وحی کی جاتی ہے لاریب میں ہی اللہ ہوں، نہیں ہے کوئی معبود مگر میں پس میری ہی بندگی کرو اور میرے ذکر کے لیے نماز قائم کرو۔ قیامت آکے رہے گی۔

یہ توحید، معاد اور قیام نماز کا وہی حکم ہے جو ہر نبی کو اول اول بطور اصول دین تلقین کیا جاتا ہے اور اسی کو لے کر وہ اپنی قوم میں جاتا ہے۔ اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ احکام ملیں اور وہ ان کی پروا کیے بغیر بنی اسرائیل کو محض نسلی عصبیت کے نعرہ پر، فرعون اور اس کی قوم سے آزادی کی لڑائی لڑنے کے لیے جمع کرنا شروع کر دیں۔

اس سلسلہ کی دوسری نہایت اہم آیت یہ ہے:۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ	اور ہم نے بھیجا موسیٰ کو اپنی آیتوں کے ساتھ کہ نکالو اپنی قوم کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف اور ان کو یاد دلاؤ اللہ کی نعمت و نقمت کے دن۔ بے شک اس کے اندر ہیں دلیلیں ہر ثابت قدم اور شکر گذار کے لیے۔

اپنی قوم کو تاریکی سے نکال کر روشنی کی طرف لیجانا ہر پیغمبر کا فرض منصبی ہے اور تقریباً انہی الفاظ میں قرآن مجید نے ہر نبی کی صفت بیان کی ہے کہ وہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لیجاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ تاریکی سے مراد عقائد و اعمال کی ظلمت اور روشنی سے مراد ایمان و اسلام کی روشنی ہے۔ اور جب اسی مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو ان کی قوم کی طرف بھیجا تھا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ قوم کو عقائد و اعمال کی تاریکیوں میں چھوڑ کر صرف اس کی سیاسی آزادی کی فکر میں پڑ جاتے۔

اب اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ان کاموں کو دیکھیے جو انھوں نے مصر کی بالکل ابتدائی زندگی میں اپنی قوم کے اندر کیے۔

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰىٓ اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ۭ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝ وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ۝ فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَقَالَ مُوْسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ

پس موسیٰ پر ایمان نہ لائے مگر اس کی قوم کے کچھ نوجوان فرعون اور اپنے سرداروں سے ڈرتے ہوئے کہ کہیں وہ کسی آفت میں نہ ڈال دیں۔ بے شک فرعون ملک میں مستبد اور زیادتی کرنے والا تھا۔ اور موسیٰ نے کہا اے میری قوم کے لوگو اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو تو اسی پر توکل کرو اگر تم مسلم ہو۔ انھوں نے کہا ہم نے اللہ ہی پر توکل کیا۔ اے ہمارے پروردگار ہم کو ظالموں کے فتنہ کا نشانہ نہ بنا اور ہم کو اپنی رحمت سے کافروں کی قوم سے نجات دے۔ اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کے پاس وحی بھیجی کہ تم اپنی قوم کے لیے مصر میں گھر بناؤ اور اپنے گھروں کو قبلہ بناؤ اور نماز قائم کرو اور ایمان والوں کو خوش خبری دو۔ اور موسیٰ نے کہا اے ہمارے پروردگار تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں زینت اور مال دیا ہے تاکہ وہ تیری راہ سے لوگوں کو بھٹکائیں

. . . .

یہ اس وقت کا حال بیان ہوا ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت شروع ہوئی ہے۔ اس کا تجزیہ کرکے دیکھیے کہ مصری ابتدائی زندگی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اردگرد بنی اسرائیل کے جو افراد اکٹھے ہوئے تھے وہ کس دعوت پر جمع ہوئے تھے؟ ان کے سامنے اخلاق و عمل کے کیا اصول تھے؟ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے کس اعتبار سے علیحدہ سمجھتے تھے؟ مصری زندگی میں ان کو خاص تربیت کس بات کی دی جا رہی تھی؟ اور فرعون اور اس کی قوم سے ان کی لڑائی کس بات کے لیے تھی؟

الف۔ ان آیات سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ ابتدائے دعوت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر صرف تھوڑے سے نوجوان ایمان لائے۔ اور انہی مومنین سے ان کی جماعت بنی۔ یہ نہیں ہوا کہ محض قومی نعرہ پر انھوں نے ہر اسرائیلی کو اپنے پیچھے لگا لینے کی کوشش کی ہو۔

ب۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام مناسب موقع پر اپنے صحابہ کو ایمان و اسلام کے مقتضیات و مطالبات سمجھاتے رہتے تھے چنانچہ ابتدائی دور میں جب اندیشہ ہوا کہ فرعون کی طرف سے ان کے ساتھیوں پر سختیاں ہوں گی تو انھوں نے لوگوں کو ایمان و اسلام کی حقیقت سمجھائی کہ اگر ایمان و اسلام کا دعویٰ لیکر اٹھے ہو تو خدا پر پورا بھروسہ رکھو اور ان کے صحابہ نے یہ کہا کہ ہم اللہ پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ بعینہٖ یہی بات سورہ اعراف میں بھی بیان ہوئی ہے۔ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا، اللہ تعالیٰ سے مدد چاہو اور ثابت قدم رہو۔ بے شک ملک اللہ کا ہے جس کو چاہے اپنے بندوں میں سے دے اور انجام کار کی کامیابی اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے ہے)

ج۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحابہ نسلی قومیت کے اختلاف کی وجہ سے فرعون اور اس کی قوم سے نجات نہیں چاہتے

تھے بلکہ قوم کافر کے ظلم و ستم سے نجات چاہتے تھے (وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ) جس کے معنی یہ ہیں کہ قبطیوں سے ان کی نزاع عقائد و اصول کی نزاع تھی نہ نسل و نسب کی۔ اور سیاسی و معاشی مفاد کی۔

د۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مصر کی ابتدائی زندگی ہی میں حکم ملا کہ مصر میں مختلف مسجدیں تعمیر کرکے اور (غالباً) اپنی مسجد کو مرکز بنا کر نماز کا اہتمام کریں۔ یہ وہی تربیت و تزکیہ ہے جو ہر نبی کی دعوت میں ہم کو سب سے مقدم اور سب سے زیادہ اہم چیز کی حیثیت سے نظر آتی ہے۔

ﮪ۔ اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ نماز قائم کرنے والے اہل ایمان کو اللہ کی تائید و نصرت کی بشارت دو (وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ) یہ نہیں کہا گیا کہ بنی اسرائیل کو بشارت دو۔

و۔ آخر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے جو دعا کی ہے اس میں فرعون کی یہ شکایت نہیں کی ہے کہ اس نے اقتدار پاکر ان کی قوم کی خود مختاری چھین لی ہے بلکہ یہ شکایت کی ہے کہ (رَبَّنَا لِيُضِلُّوا عَنْ سَبِيلِكَ) اے پروردگار ان کا مال و جاہ اس لیے ہے کہ وہ تیری راہ سے لوگوں کو بھٹکائیں۔

ان ساری باتوں کو سامنے رکھ کر غور کیجیے کہ کیا یہ بعینہٖ وہی دعوت نہیں ہے جو مکہ کی زندگی میں آنحضرت صلعم نے دی اور کیا یہ وہی تربیت نہیں ہے جو ہجرت سے پہلے صحابہ کو دی گئی؟ کیا ان واضح دلائل کے بعد بھی اس غلط فہمی میں پڑنے کا کوئی موقع ہے کہ مصر کی زندگی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے کافر و مومن میں کوئی فرق نہیں کیا بلکہ ان کو بحیثیت بنی اسرائیل آزادی کے مطالبہ پر متفق کرنے کی کوشش کی؟

اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تنظیم، بلا لحاظ کفر و ایمان، مجرد نسلی قومیت پر مبنی ہوتی تو مشہور اسرائیلی سرمایہ دار، قارونؔ اس سے الگ نہ رکھا جاتا بلکہ جس طرح وطنی اور نسلی قومیت کی اساس پر اٹھنے والی تحریکیں برلا، ڈلمیا، بجاج اور سیٹھوں، مہاجنوں، بینکروں اور تعلقہ داروں کو اپنانے کی کوشش کرتی ہیں، اور آسانی سے اپنا لیتی ہیں اسی طرح حضرت موسیٰؑ بھی نہایت آسانی سے اس کو اپنی تحریک کا ایک لیڈر بنا لیتے لیکن ہوا یہ کہ آل فرعون کا ایک مومن جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے، موسیٰ علیہ السلام کی تنظیم میں داخل ہو جاتا ہے لیکن بنی اسرائیل کا یہ "سب سے بڑا آدمی" فرعون و ہامان کے زمرہ میں داخل کر دیا جاتا ہے وَقَارُونَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامَانَ ۖ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مُوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ وَمَا كَانُوا سَابِقِينَ (اور قارون، فرعون اور ہامان کو یاد کرو۔ ان کے پاس موسیٰ کھلی ہوئی نشانیاں لے کر آیا تو انھوں نے ملک میں سرکشی کی اور ہم سے بھاگ نہ سکے) دوسری جگہ ہے۔ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا وَسُلْطَانٍ مُبِينٍ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَقَارُونَ فَقَالُوا سَاحِرٌ كَذَّابٌ (اور ہم نے بھیجا موسیٰ کو اپنی نشانیوں اور کھلی ہوئی حجت کے ساتھ، فرعون و ہامان و قارون کی طرف تو انھوں نے کہا یہ جھوٹا ساحر ہے) اور موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی اپنی قوم کے اس سب سے بڑے آدمی پر یہ الزام نہیں لگاتے کہ یہ "سرکار پرست" ہے، "قومی غدار" ہے، "رجعت پسند" ہے، "اسرائیلی لیگ کا دشمن" ہے بلکہ اس پر یہ الزام ہے کہ "خدا کا باغی" ہے، "مغرور و متکبر" ہے، "آخرت کا منکر" ہے، خدا کی نعمتوں کو اپنی لیاقت کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ اور اس کو جو دعوت دی گئی وہ بھی یہ نہیں ہے کہ اگر "اسرائیلی ہے تو بنی اسرائیل کے ساتھ آ" - اگر "ہماری قوم میں سے

ہے تو قوم کی آزادی کی جدوجہد میں حصہ لے" بلکہ اس کو یہ دعوت دی گئی کہ "زمین میں غرور نہ کر" "اللہ کی نعمتوں کو حصولِ آخرت کا ذریعہ بنا" "جس طرح اللہ نے تجھ پر احسان کیا ہے تو خلق پر احسان کر" "زمین میں خدا سے بغاوت نہ کر"۔ سورۂ قصص میں یہ پوری تفصیل پڑھ لیجیے۔ ہم صرف چند آیتیں نقل کریں گے۔

إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِن قَوْمِ مُوسَىٰ فَبَغَىٰ عَلَيْهِمْ ۖ وَآتَيْنَاهُ مِنَ الْكُنُوزِ مَا إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوءُ بِالْعُصْبَةِ أُولِي الْقُوَّةِ إِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ لَا تَفْرَحْ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ ۝ وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ ۖ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا ۖ وَأَحْسِن كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ ۖ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ۝ قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِي

بے شک قارون موسیٰ کی قوم میں سے تھا تو اس نے ان پر سرکشی کی اور ہم نے اس کو اتنے خزانے دیے جن کی کنجیاں ایک طاقتور جماعت سے اٹھتی تھیں۔ یاد کر جب اس سے اس کی قوم نے کہا (یعنی قوم کے اہل ایمان نے) اترا مت، اللہ اترانے والوں کو دوست نہیں رکھتا اور جو نعمت تجھے خدا نے دے رکھی ہے اس میں دارِ آخرت کا سامان کر اور دنیا میں سے اپنا حصہ نہ بھول اور احسان کر جیسا کہ اللہ نے تجھ پر احسان کیا ہے اور زمین میں فساد نہ چاہ۔ اللہ تعالیٰ فساد برپا کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ بولا یہ سب تو مجھے اپنے علم کی بدولت ملا ہے۔

ایک دن اس کی شان و عظمت دیکھ کر بنی اسرائیل کے بعض کمزور لوگوں نے جب یہ خواہش کی کہ کاش یہی شان و عظمت انھیں بھی حاصل ہوتی تو اہلِ ایمان نے انھیں سمجھایا کہ "وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللَّهِ خَيْرٌ لِّمَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ وَلَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الصَّابِرُونَ" (تم پر افسوس ہے، اللہ کا اجر اس سے بہتر ہے ان لوگوں کیلئے جو ایمان لائے اور جنھوں نے عمل صالح کیے اور یہ حکمت صرف صابروں کو ملتی ہے) پھر قارون کی ساری عظمت و شوکت کی تباہی کا جب تماشا دیکھ لیا تو وہی لوگ جو اس کو رشک کی نگاہوں سے دیکھتے تھے، پکار اٹھے "لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُونَ" (کافر فلاح نہیں پاتے) اس سے معلوم ہوا کہ قارون سے، باوجودیکہ وہ ایک اسرائیلی تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اختلاف محض کفر و ایمان کی بنا پر تھا۔

کیا اس تفصیل کے بعد بھی کوئی شخص یہ گمان کر سکتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مصر میں بنی اسرائیل کے کفر و ایمان سے کوئی تعرض نہیں کیا اور صرف اسرائیلیت کی اساس پر انھوں نے بنی اسرائیل کی تنظیم محض اس مقصد کے لیے کی کہ اپنی قوم کو فرعون کی غلامی سے آزاد کرلیں؟

مصر کی ابتدائی زندگی میں، بعثت سے پہلے، حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ایک ایسا فعل صادر ہوگیا جو قومی غیرت و حمیت کے نقطۂ نگاہ سے نہایت محمود تھا اور اگر وہ ایک نیشنلسٹ لیڈر ہوتے تو ان کا یہ کام نہایت شاندار کارناموں میں گنا جاتا کیونکہ قومی حمیت کے اعتبار سے کوئی شخص بھی اس کو مذموم نہیں قرار دے سکتا لیکن خدا کے انبیا کسی قوم کے حریف یا کسی قوم کے دوست بنکر نہیں آتے بلکہ صرف باطل کے حریف اور حق کے دوست بنکر آتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کا یہی فعل، جو قومی حمیت کے نقطۂ نگاہ سے نہایت قابلِ تعریف تھا، ان کی نظر میں شدید گناہ قرار پایا اور بار بار توبہ کرنے کے باوجود ان کے دل سے اس گناہ کی کھٹک نہیں نکلی۔

وَدَخَلَ الْمَدِينَةَ عَلَىٰ حِينِ غَفْلَةٍ مِّنْ أَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلَانِ هَٰذَا مِن شِيعَتِهِ

اور موسیٰ شہر میں ایسے وقت داخل ہوا کہ شہر کے باشندے ابھی غافل ہی تھے تو دیکھا کہ وہاں دو شخص لڑ رہے ہیں ایک اس کی قوم

وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ۚ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِيْ مِنْ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ ۖ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ۖ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ فَغَفَرَ لَهٗ ۗ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ قَالَ رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ

(بنی اسرائیل) کا ہے اور دوسرا اس کے دشمنوں (قبطیوں) میں سے ہے تو اس سے مدد چاہی اس کی قوم کے آدمی نے اس شخص کے خلاف جو اس کے دشمنوں میں سے تھا تو موسیٰ نے اس کے تھپڑ مار دی اور اس کا خاتمہ ہو گیا۔ موسیٰ فوراً پکار اٹھا یہ شیطانی کام ہو گیا، بے شک شیطان کھلا ہوا گمراہ کرنے والا ہے اور دعا کی کہ اے میرے پروردگار میں نے اپنی جان پر ظلم ڈھایا، تو مجھے معاف کر، تو اللہ نے اس کو معاف کیا، بے شک وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ پھر کہا اے میرے پروردگار چونکہ تو نے مجھ پر فضل فرمایا ہے اس لیے اب میں مجرموں کا مددگار کبھی نہ بنوں گا۔

اس واقعہ کے دوسرے ہی دن حضرت موسیٰ علیہ السلام پھر شہر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہی اسرائیلی جو کل ایک قبطی سے لڑ رہا تھا آج ایک دوسرے قبطی کے ساتھ الجھا ہوا ہے اور اس نے ان کو دیکھتے ہی پھر مدد کے لیے پکارا لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو سختی سے ڈانٹا کہ "انک لغوی مبین" تو نہایت کھلا ہوا شریر ہے اور مجرموں کی مدد نہ کرنے کا جو وعدہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے کیا تھا اس پر قائم رہے۔

یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے پہلے کی زندگی کا ہے جبکہ ان پر ایمان و عدل کے اصول ابھی الہام بھی نہیں ہوئے تھے اور ایک غیور نوجوان ہونے کے لحاظ سے قومی حمیت ان کے لیے سب سے زیادہ قوی محرک ہو سکتی تھی بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ ان کی قوم مصر میں قبطیوں کے ہاتھوں اس سے زیادہ ذلیل ہو رہی تھی جتنے کہ امریکیوں کے ہاتھوں ریڈ انڈین یا انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستانی قلی۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے کسی قوم کے بحیثیت قوم حامی اور کسی قوم کے بحیثیت قوم حریف بننے سے انکار کیا اور اللہ تعالیٰ سے صرف حق و عدل کا ساتھ دینے کا عہد باندھا اور اس عہد کی جانچ کا اتفاق سے دوسرے ہی دن جب موقع پیدا ہو گیا تو وہ اللہ کی توفیق سے اس عہد پر قائم رہے۔ غور کا مقام ہے کہ جو حضرت موسیٰ اپنی بعثت سے پہلے کی زندگی میں، اپنے اللہ سے اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ میں کسی مجرم کا حامی نہ بنوں گا، خواہ وہ میری قوم کا آدمی ہو، انہی حضرت موسیٰ پر ہمارے بزرگان دین یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ بعثت کے بعد کی زندگی میں اپنی قوم کے بحیثیت قوم حامی بن گئے۔ ان کے کافر و مومن، اور نیکوکار و بدکار میں انھوں نے کوئی فرق نہیں کیا۔

اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ کی صحیح تفسیر

اس ساری بحث کے بعد ان حضرات کی تیسری غلط فہمی سے تعرض کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی کیونکہ قومی آزادی کے ایک مقدس فریضہ ہونے کی ساری دلیل درحقیقت ان دو بنیادی غلط فہمیوں پر قائم تھی جن کی نہایت تفصیل کے ساتھ ہم تردید کر چکے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت اور ان کے کاموں کی صحیح نوعیت واضح ہو جانے کے بعد یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ دنیا میں جتنے نبی بھی آئے وہ ایک ہی مقصد کی دعوت لے کر آئے۔ یعنی خالص اللہ کی بندگی اور اطاعت کی دعوت۔ ان سب کے نزدیک تمام نیکیوں اور سعادتوں کا سرچشمہ اللہ کی بندگی اور اطاعت ہے اور تمام برائیوں کی جڑ خدا کی بندگی اور اطاعت سے انحراف ہے۔ ان کے نزدیک آزادی کا بھی مفہوم یہ ہے کہ کسی انسان کی گردن میں اللہ کی اطاعت کے سوا کسی اور کی اطاعت کا قلادہ نہ ہو اگرچہ وہ" اور" انسان کی

خود اپنی ہی قوم، یا اپنا ہی قبیلہ بلکہ اپنا ہی نفس ہو اور غلامی کا مفہوم یہ ہے کہ انسان غیر اللہ کی بندگی اور اطاعت کرے اگرچہ وہ غیر اپنی ہی قوم، اپنا ہی قبیلہ اور اپنا ہی نفس ہو۔ ان کے نزدیک یہ ظلم کبیر ہے کہ کوئی قوم کسی قوم سے بجبر اپنی اطاعت کرائے اور یہ ظلم اکبر ہے کہ کوئی قوم باختیار خود اپنے بنائے ہوئے قانون کی اطاعت کرے۔ یہ دونوں ہی باتیں شرک ہیں اور انبیاء کا طریقہ ہرگز نہ نہیں ہے کہ وہ ایک ظلم کبیر کی مخالفت کریں اور دوسرے ظلم اکبر کو برپا کرنے کے لیے خود قیادت کا علم لے کر اٹھیں۔ پس اس بات کے لیے تو کوئی وجہ جواز نہیں ہو سکتی کہ جس فساد میں فرعون اور اس کی قوم کے لوگ مبتلا تھے اسی فساد کا حق اپنی قوم کے لیے حاصل کرنے کی تحریک حضرت موسیٰ علیہ السلام اٹھائیں۔ وہ اگر کر سکتے تھے تو صرف یہ کام کر سکتے تھے کہ حاکم و محکوم دونوں کو احکم الحاکمین کی بندگی و اطاعت کی دعوت دیں۔ اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ انھوں نے یہ کام نہ کیا ہو۔ فرعون اور اس کی قوم سے بنی اسرائیل کی علیحدگی کی کوئی وجہ اگر ہو سکتی تھی تو یہ نہیں کہ یہ علیحدہ قوم ہیں اور وہ علیحدہ۔ بلکہ صرف یہ ہو سکتی تھی کہ یہ مومن ہیں اور وہ کافر۔ دو قوموں کا مجرد نسلی اور وطنی امتیازات کی بنا پر الگ الگ اپنی حاکمیت کا علم گاڑنا تو وہ عصبیت جاہلیت ہے جس پر انبیاء لعنت کرنے کے لیے بھیجے جاتے ہیں نہ کہ اس کی تحریک چلانے کے لیے۔ پس فرعون اور اس کی قوم کے لوگ اگر ایمان لاتے اور اپنی حاکمیت کے دعوے سے اللہ واحد کے حق میں دست بردار ہو جاتے تو بنی اسرائیل اور وہ ایک باپ کے بیٹوں اور ایک خدا کے بندوں کی طرح ایک گھر میں بس سکتے تھے۔ سوچنے کی بات ہے کہ آخر جھگڑا کس بات کا تھا؟ اس بات کا کہ فرعون اور اس کی قوم کے لوگ کیوں حاکم ہیں، بنی اسرائیل کیوں حاکم نہیں ہیں یا اس بات کا کہ اللہ واحد کی حکومت کیوں نہیں ہے، فرعون کی حکومت اور خدائی کیوں ہے؟ اگر جھگڑا موخر الذکر بات کے لیے تھا اور یقیناً اسی بات کے لیے ہو سکتا تھا تو ٹھیک راہ یہی تھی کہ حضرت موسیٰ اپنے عہد کے مستکبرین کو دعوت ایمان و اسلام دیتے اور قرآن مجید سے ثابت ہے کہ یہی انھوں نے کیا اور ان کی دعوت کی یہی کشش تھی کہ فرعون کی قوم کے اہل حق ان کی بات پر ایمان لائے ورنہ اگر ایک نسلی نزاع ہوتی تو حضرت موسیٰ کی بات ان کے قومی دشمنوں کو کیوں اپیل کرتی؟

اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد اب اس بات پر غور کیجیے کہ حضرت موسیٰ اور ہارون نے فرعون سے یہ جو مطالبہ کیا کہ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دو) اس کا مطلب کیا ہے؟ قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگذشت بیان کرتے ہوئے کئی جگہ ان کے اس مطالبہ کا ذکر ہوا ہے لیکن جس طرح بنی اسرائیل کی تاریخ کے واقعات ہر جگہ قرآن میں اختصار و اجمال کے ساتھ بیان ہوئے ہیں اسی طرح یہ بات بھی اجمال ہی کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ کسی جگہ بھی اس بات کی تشریح نہیں ہوئی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو کس مقصد کے لیے اور کہاں لیجانا چاہتے تھے۔ البتہ اتنی بات قرآن مجید اور تورات دونوں سے واضح ہے کہ یہ مطالبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بالکل ابتدائی مطالبات میں سے ہے۔ ہمارے یہ علما (جو نیشنلزم کو بھی انبیاء کا لایا ہوا دین سمجھتے ہیں)، کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ تھا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کو مصر سے نکال کر دوسرے ملک میں لے جانا چاہتے تھے لیکن اوپر کے مباحث سے یہ بات صاف ہو چکی ہے کہ یہ بات کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب فرعون اور اس کی قوم کی طرف بحیثیت رسول اور شاہد کے آئے تھے اور یہی حیثیت ان کی بنی اسرائیل کے لیے بھی تھی تو کوئی نبی اتمام حجت و دعوت کے بغیر، ان لوگوں کو نہیں چھوڑ سکتا جن کی طرف وہ رسول بنا کر بھیجا گیا ہو۔ ہر پیغمبر کے فرائض رسالت میں سے یہ بات ہے کہ وہ لوگوں کو دعوت حق دے۔ اس دعوت کو پھیلانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگائے

اپنی دعوت کو قوم کے ایک ایک فرد کے کانوں تک پہنچائے۔ اس حق کو واضح کرنے کے لیے تمام ممکن وسائل استعمال کرے اور ایک مدت تک اپنی بہترین عملی سیرت اور بہترین قولی تبلیغ سے حق کو اتنا آشکارا کر دے کہ جو لوگ اس کا انکار کرنا چاہیں ان کے پاس ضد اور ہٹ دھرمی کے سوا کوئی اور پناہ باقی نہ رہ جائے۔ یہ سارے جتن کرنے کے بعد جب وہ ان کے قبول حق سے بالکل مایوس ہو جائے اور قوم اس کی جان کے درپے ہو جائے تب وہ اللہ کے اذن سے ان کو چھوڑ کر ہجرت کرے۔ لیکن أَرْسِلْ مَعَنَا کی جو تفسیر یہ حضرات کرتے ہیں اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نہ فرعون کے کفر و ایمان سے بحث تھی نہ بنی اسرائیل کی تعلیم و تربیت سے کوئی غرض تھی بلکہ وہ آنے سے پہلے ہی جانے کا پروانہ لے کر آئے تھے۔ چنانچہ انھوں نے پہنچتے ہی فرعون کے سامنے یہ مطالبہ رکھ دیا کہ بنی اسرائیل کو آزاد کر۔ یہ بات تمام انبیاء کی سنت کے بھی خلاف ہے اور قرآن کے بیان کے بھی، جیسا کہ اوپر واضح ہو چکا ہے، بالکل خلاف ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس آیت کا صحیح مطلب معلوم کیا جائے۔

ہمارے نزدیک اصول یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی تاریخ کے جو واقعات قرآن مجید میں مجمل بیان ہوئے ہیں ان کی وضاحت کے لیے تورات کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور تورات کا بیان اگر قرآن کے بیان یا اس کے کسی اصول کے خلاف نہ پڑے تو اس توضیح کو قبول کرنا چاہیے۔ اور بالخصوص ان مواقع میں تو تورات کا بیان بالکل غیر مشتبہ ماننا چاہیے جہاں کوئی بات مرتبین تورات کی خواہش کے بالکل خلاف مسخ و تحریف سے بچ رہی ہے۔ اوپر ہم لکھ چکے ہیں کہ تورات میں بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے کی تاریخ بالکل ایک قومی آزادی کی جدوجہد کے رنگ میں پیش کی گئی ہے، اور اس کو پڑھتے ہوئے بار بار ایسا گمان ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ جو مطالبہ کرتے ہیں کہ "میرے لوگوں کو جانے دے" تو ان کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ ان کو آزاد کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس ذوق کے لوگوں کے لیے یہ بات بڑی ہی اپیل کرنے والی ہو سکتی تھی کہ خدا کا ایک جلیل القدر پیغمبر ان کی آزادی کا مطالبہ لے کر مبعوث ہوا۔ چنانچہ اپنی برتری کے نشہ میں انھوں نے بہت سی باتوں کو جو ایک بالکل ہی مختلف پہلو رکھتی تھیں، بالکل قومی رنگ دے دیا ہے لیکن تعجب ہے کہ ارسل معنا کی تفسیر تورات میں اس سے بالکل مختلف ہے جو یہ حضرات بیان کرتے ہیں۔ اور یہ تفسیر ایسی ہے کہ کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس کا انکار کیا جائے۔ ہم پہلے ایک مناسب ترتیب کے ساتھ اس کے متعلق تورات میں جو کچھ ہے اس کو پیش کرتے ہیں اس کے بعد اس کے متعلق اپنی رائے ظاہر کریں گے۔

تورات کی کتاب الخروج میں اس مطالبہ کا ذکر بار بار آیا ہے۔ بعض جگہ تو جس طرح قرآن مجید میں مجمل ہے اسی طرح تورات میں بھی مجمل ہے لیکن پھر دوسرے مقامات میں ایسی تفصیلات آگئی ہیں کہ پوری بات صاف ہو جاتی ہے۔ کتاب الخروج باب ۳ ۱۸-۲۰ میں خداوند خدا حضرت موسیٰ اور ہارون کو فرعون سے یہ مطالبہ کرنے کا حکم دیتا ہے :-

"اب تو ہم کو تین دن کی منزل بیابان میں جانے دے تاکہ ہم خداوند اپنے خدا کے لیے قربانی کریں اور میں جانتا ہوں کہ مصر کا بادشاہ نہ تم کو یوں جانے دے گا نہ بڑے زور سے۔ سو میں اپنا ہاتھ بڑھاؤں گا اور مصر کو ان سب عجائب سے جو میں اس میں کروں گا، مصیبت میں ڈالوں گا۔ اس کے بعد وہ تم کو جانے دے گا۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام قربانی کرنے کے لیے، پوری قوم کے ساتھ کسی ایسے مقام پر جانا چاہتے تھے جو بیابان میں تین دن کی منزل پر تھا۔ اس مقام کے بارہ میں محققین میں اختلاف ہے اور ہم یہاں اس بحث میں نہیں

پڑنا چاہتے۔ اس کے بعد اس کی کچھ مزید تفصیل آتی ہے۔

"خداوند خدا اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے کہ میرے لوگوں کو جانے دے تاکہ وہ بیابان میں میرے لیے عید کریں۔ فرعون نے کہا کہ خداوند کون ہے کہ میں اس کی بات کو مان کر اسرائیل کو جانے دوں۔ میں خداوند کو نہیں مانتا اور میں اسرائیل کو جانے بھی نہیں دوں گا۔ تب انھوں نے کہا عبرانیوں کا خدا ہم سے ملا ہے سو ہم کو اجازت دے کہ ہم تین دن کی منزل بیابان میں جا کر خداوند اپنے خدا کے لیے قربانی کریں تا نہ ہو کہ وہ ہم میں وبا بھیجدے یا ہم کو تلوار سے مروا دے۔ تب مصر کے بادشاہ نے ان کو کہا اے موسیٰ اور اے ہارون تم کیوں ان لوگوں کو ان کے کام سے چھڑواتے ہو۔ تم جا کر اپنے اپنے بوجھ کو اٹھاؤ اور فرعون نے یہ بھی کہا دیکھو یہ لوگ اس ملک میں بہت ہو گئے ہیں اور تم ان کو ان کے کام سے بٹھاتے ہو اور اس دن فرعون نے بیگار لینے والوں اور سرداروں کو جو لوگوں پر تھے حکم کیا کہ اب آگے کو تم ان لوگوں کو اینٹیں بنانے کے لیے بھس نہ دینا جیسے اب تک دیتے رہے ہو۔ وہ خود ہی جا کر بھس بٹوریں اور ان سے اتنی اینٹیں بنوانا جتنی وہ اب تک بناتے آئے ہیں۔ تم اس میں سے کچھ نہ گھٹانا کیونکہ وہ کاہل ہو گئے ہیں۔ اسی لیے چلا چلا کر کہتے ہیں ہم کو جانے دو کہ ہم اپنے خدا کے لیے قربانی کریں۔" (خروج باب ۱-۵)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جس قربانی کے لیے جانا چاہتے تھے وہ اجتماعی قربانی تھی اور اس کی حیثیت عید کی تھی جس میں بنی اسرائیل کے ہر خرد و کلاں کی شرکت مطلوب تھی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ فرعون کو جس سبب سے ان کو جانے دینے سے انکار تھا وہ یہ تھا کہ جو کار خدمت ان لوگوں کے سپرد تھا اس میں ہرج ہو گا۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کے عذاب سے وہ تنگ آ گیا تب ایک حد تک راضی ہوا۔

"تب فرعون نے موسیٰ اور ہارون کو بلوا کر کہا تم جاؤ اور اپنے خدا کے لیے اسی ملک میں قربانی کرو۔ موسیٰ نے کہا ایسا کرنا مناسب نہیں کیونکہ ہم خداوند اپنے خدا کے لیے اس چیز کی قربانی کریں گے جس سے مصری نفرت رکھتے ہیں۔ سو اگر ہم مصریوں کی آنکھوں کے آگے اس چیز کی قربانی کریں گے جس سے مصری نفرت رکھتے ہیں تو کیا وہ ہم کو سنگسار نہ کر ڈالیں گے؟ فرعون نے کہا میں تم کو جانے دوں گا تاکہ خداوند اپنے خدا کے لیے بیابان میں قربانی کرو لیکن تم بہت دور مت جانا۔" (خروج ۸: ۲۵-۲۹)

اس سے معلوم ہوا کہ مصر سے باہر بیابان میں جا کر قربانی کرنے کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ گائے کی قربانی کرنا چاہتے تھے اور مصری گائے کو ہمارے ملک کے ہندوؤں کی طرح، مقدس اور معبود خیال کرتے تھے اور چونکہ ان کے ہاتھ میں پورا اقتدار تھا اس وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اندیشہ تھا کہ اگر انھوں نے گائے کی قربانی مصر میں کی اور وہ بھی اجتماعی شکل میں تو مصری ان کو سنگسار کر دیں گے۔ نیز یہیں سے یہ بات بھی نکلی کہ یہ اجتماعی قربانی موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں قدیم سے جاری رہی ہو گی لیکن مصریوں نے گائے کے تقدس کی وجہ سے اس کو بند کر دیا ہو گا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اس قربانی کی تجدید کرنا چاہتے ہوں گے۔ اس تجدید کی تو فرعون نے مجبور ہو کر اجازت دے دی لیکن چونکہ یہ اجتماعی قربانی تھی، جس طرح ہمارے یہاں عید اضحیٰ، اس وجہ سے آگے چل کر ایک اور جھگڑا پیدا ہو گیا۔

"تب موسیٰ اور ہارون پھر بلائے گئے اور اس نے ان کو کہا جاؤ اور خداوند اپنے خدا کی عبادت کرو پر وہ کون کون ہیں جو

جائیں گے؟۔ موسیٰ نے کہا ہم اپنے جوانوں اور بڈھوں اور ہم اپنے بیٹوں اور بیٹیوں اور اپنی بھیڑ بکریوں اور اپنے گائے بیلوں سمیت جائیں گے کیونکہ ہم کو اپنے خدا کی عید کرنی ہے۔ تب اس نے ان کو کہا کہ خداوند ہی تمھارے ساتھ رہے۔ میں تو ضرور ہی تم کو بچوں سمیت جانے دوں گا۔ خبردار ہو جاؤ، اس میں تمھاری خرابی ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہونے پائے گا۔ تم مرد ہی مرد جا کر خداوند کی عبادت کرو کیونکہ تم یہی چاہتے تھے اور وہ فرعون کے پاس سے نکال دیے گئے۔" (خروج ۱۰: ۸-۱۱)

اس سے معلوم ہوا کہ چونکہ یہ قربانی، ہماری عید اضحیٰ کی طرح، عام قربانی کے ایک تہوار کی تجدید تھی اس وجہ سے حضرت موسیٰؑ کا مطالبہ یہ تھا کہ اس میں پوری قوم کو شرکت کی اجازت دی جائے اور قربانی کے لیے جانور بھی لے جانے کی اجازت دی جائے۔ فرعون نے بالآخر، خدا کے عذاب سے تنگ آ کر، مطالبہ کا پہلا حصہ منظور کیا لیکن دوسرے حصہ کو منظور کرنے سے انکار کر دیا۔

"تب فرعون نے موسیٰ کو بلوا کر کہا تم جاؤ اور خداوند کی عبادت کرو فقط اپنی بھیڑ بکریوں اور گائے بیلوں کو یہیں چھوڑ جاؤ اور جو تمھارے بال بچے ہیں ان کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ موسیٰ نے کہا تجھے ہم کو قربانیوں اور سوختنی قربانیوں کے لیے جانور دینے پڑیں گے تاکہ ہم خداوند اپنے خدا کے آگے قربانی کریں سو ہمارے چوپائے بھی ہمارے ساتھ جائیں گے اور ان کا ایک کھُر تک بھی پیچھے نہیں چھوڑا جائے گا کیونکہ ان ہی میں سے ہم کو خداوند اپنے خدا کی عبادت کا سامان لینا پڑے گا اور جب تک ہم وہاں نہ پہنچ جائیں ہم نہیں جانتے کہ کیا لے کر ہم کو خداوند کی عبادت کرنی ہوگی۔" (خروج ۱۰: ۲۴-۲۶)

بالآخر یہ قصہ یہاں تک بڑھا اور مصر اس اثنا میں خداوند تعالیٰ کی بھیجی ہوئی آفتوں سے اس قدر تباہ ہوا کہ مصریوں نے فرعون پر زور ڈالنا شروع کر دیا کہ ان لوگوں کو مصر سے یکقلم نکال دیا جائے۔ چنانچہ یہی مطالبہ مصر سے بنی اسرائیل کی ہجرت کا سبب بن گیا

"تب اس نے رات ہی رات موسیٰ اور ہارون کو بلوا کر کہا کہ تم بنی اسرائیل کو لے کر لوگوں میں سے نکل جاؤ اور جیسا کہتے ہو جا کر خداوند کی عبادت کرو اور اپنے کہنے کے مطابق اپنے بھیڑ بکریاں اور گائے بیل بھی لیتے جاؤ اور میرے لیے بھی دعا کرنا اور مصری ان لوگوں سے بجد ہونے لگے تاکہ ان کو ملک مصر سے جلد باہر چلتا کریں کیونکہ وہ سمجھے کہ ہم سب مر جائیں گے۔ سو ان لوگوں نے اپنے گندھے گندھائے آٹے کو بغیر خمیر دیے لگنوں سمیت کپڑوں میں باندھ کر اپنے کندھوں پر دھر لیا۔" (خروج ۱۲: ۳۱-۳۵)

"اور انھوں نے اس گندھے ہوئے آٹے کی جسے وہ مصر سے لائے تھے بے خمیری روٹیاں پکائیں کیونکہ وہ اس میں خمیر دینے نہ پائے تھے اس لیے کہ وہ مصر سے ایسے جبراً نکال دیے گئے کہ وہاں ٹھہر نہ سکے اور نہ کچھ کھانا اپنے لیے تیار کرنے پائے۔" (خروج ۱۲: ۳۰)

بنی اسرائیل کو مصر سے جبراً نکالنے کے بعد ان کے تعاقب کی وجہ توریت میں یہ بیان ہوئی ہے:-

"جب مصر کے بادشاہ کو خبر ملی کہ وہ لوگ چل دیے تو فرعون اور اس کے خادموں کا دل ان لوگوں کی طرف سے پھر گیا اور وہ کہنے لگے کہ ہم نے یہ کیا کیا کہ اسرائیلیوں کو اپنی خدمت سے چھٹی دے کر ان کو جانے دیا۔ تب اس نے اپنا رتھ تیار کروایا اور اپنی قوم کے لوگوں کو ساتھ لیا۔" (خروج ۱۴: ۵-۶)

توریت کے ان بیانات سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے یہ جو مطالبہ کیا کہ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دے۔ یہ آزادی کا مطالبہ نہیں تھا بلکہ ان کے ہاں اجتماعی قربانی کی جو عبادت حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب علیہم السلام کے وقت سے جاری تھی[1] اور جو مصر میں، گائے کے تقدس کی وجہ سے، بند کر دی گئی تھی اس کی تجدید کا مطالبہ تھا۔ یہ معلوم ہے کہ بنی اسرائیل اپنے پاس ایک دین رکھتے تھے، جس میں ہرچند، مصر کی غلامی کی وجہ سے، بہت سی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں، لیکن وہ انبیا کا دین تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے ضروری تھا کہ پہلے اس کی تجدید کی جدوجہد کریں۔ بنی اسرائیل کے یہاں عبادات میں قربانی کو جو اہمیت حاصل ہے وہ معلوم ہے۔ اور یہ اہمیت اس وقت ہزار گنا بڑھ جاتی ہے جب کہ حاکم قوم کی طرف سے وہ جبراً روک دی گئی ہو۔ اس وجہ سے اس کو زندہ کرنے کی کوشش ان کے مقدم ترین فرائض میں تھی۔ پس موسیٰ علیہ السلام نے ایک طرف تو حاکم قوم کو دعوت ایمان و اسلام دی اور ان سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے دعوائے حاکمیت سے احکم الحاکمین کے حق میں دست بردار ہو جائیں اور دوسری طرف بنی اسرائیل کو اللہ کی بندگی و اطاعت کی دعوت دی اور کوشش کی کہ ان کو اس بندگی و اطاعت کے لیے پوری آزادی حاصل ہو جائے۔ اگر حاکم قوم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت قبول کر لیتی تو سارا جھگڑا ختم تھا، لیکن جیسا کہ ہر نبی کے زمانہ کے مستکبرین نے اپنے نبیوں کا انکار کیا اور اتمام حجت کے بعد ان کو ہجرت کرنی پڑی اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے مستکبرین نے بھی ان کا انکار کیا اور وہ ان لوگوں کے ساتھ ہجرت کر گئے، جو ان پر ایمان لائے۔ ان ایمان لانے والوں میں مصری بھی تھے اور اسرائیلی بھی۔ اور جن لوگوں نے ان کی تکذیب کی وہ تباہ ہو گئے، اور ان تباہ ہونے والوں میں بھی دونوں ہی شامل تھے۔ اسرائیلی بھی اور قبطی بھی۔ البتہ بنی اسرائیل من حیث القوم حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے۔ اس کی بڑی وجہ تو وہی تھی جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ یہ لوگ ارباب اقتدار میں نہیں تھے کہ مفاد پرستی اور غرور ان کے ایمان کی راہ میں حائل ہوتا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کے اندر دین حق کے اجزا موجود تھے جو مصر کی زندگی میں دب تو ضرور گئے تھے، لیکن فنا نہیں ہوئے تھے اس وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت ان کے لیے بیگانہ چیز نہیں تھی۔ اس کے بالکل برعکس قبطی ملأ مستکبرین کی حیثیت رکھتے تھے اس وجہ سے وہ حق کو حق جانتے ہوئے بھی، جیسا کہ قرآن اور تورات دونوں سے واضح ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب پر اڑے رہے۔ صرف تھوڑے سے لوگ، جو بیدار ضمیر رکھتے تھے، ایمان لائے[2]۔

اس پوری بحث کو ٹھنڈے دل سے مطالعہ کرنے کے بعد، غور فرمائیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسوہ کی پیروی وہ لوگ

---

[1] ہماری تحقیق یہ ہے کہ اس طرح کی اجتماعی قربانی بنی اسرائیل میں قدیم زمانہ سے جاری تھی لیکن یہاں اس کی تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔ توریت کی کتاب پیدائش میں اس کے دلائل موجود ہیں۔

[2] یہاں کسی کو یہ شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام غیر قبطی ہونے کی وجہ سے قبطیوں پر حجت تمام نہیں کر سکتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بلاشبہ اسرائیلی تھے لیکن ان کی پرورش فرعون کے محل میں ہوئی تھی اس وجہ سے وہ ان کی زبان اور روایات ہر چیز سے پوری طرح واقف تھے۔ وہ قبطیوں کے لیے اسی طرح رسول تھے جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام۔ (امین احسن)

کر رہے ہیں جو وطنی یا تہذیبی اشتراک کی بنا پر ہندی نیشنلزم یا مسلمان نیشنلزم کا فتنہ اٹھا رہے ہیں اور انگریزوں سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ جو فساد دنیا میں تم کر رہے ہو وہ فساد کرنا ہمارا بھی "پیدائشی حق" ہے یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسوہ کی پیروی جماعت اسلامی کر رہی جو حاکم و محکوم دونوں کو صرف احکم الحاکمین کی بندگی کی دعوت دے رہی ہے اور تمام بنی آدم کو یکساں پکار رہی ہے کہ اللہ واحد کے سوا کسی کی بندگی جائز ہے نہ اطاعت؟ اور پھر اس بات پر غور فرمائیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسوہ کی پیروی وہ لوگ کر رہے ہیں جو مسلمانوں کو مسلمان قوم کے نعرہ پر جمع کر رہے ہیں قطع نظر اس سے کہ ان میں کون اسلام کے اصولوں پر ایمان رکھتا ہے اور کون نہیں یا جماعت اسلامی کر رہی ہے جو مسلمانوں کے اندر ایمان و اسلام اور توحید و آخرت کے مقتضیات کا شعور پیدا کرکے اسلامی اصولوں کے مطابق ان کی تربیت کرنا چاہتی ہے؟

آخر میں محترم معترض نے مسلم تحریک کی جو روایت نقل کی ہے اس کے متعلق گزارش ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ اگر کوئی تربیت یافتہ جماعت جہاد کے لیے اٹھ رہی ہو تو وہ اپنے ساتھ بعض ایسے افراد بھی لگا لے تو کچھ حرج نہیں جن کی پوری تربیت نہ ہوئی ہو لیکن اس بات کا ثبوت ہرگز نہیں ملتا کہ ناتربیت یافتوں کی ایک فوج مرتب کرکے جہاد کیا جا سکتا ہے۔ بدر کی لڑائی جن لوگوں کے ذریعہ سے لڑی گئی وہ پوری تاریخ انسانی میں نوع انسانی کے گل سرسبد تھے۔ اگر ان کے ساتھ کوئی ناتربیت یافتہ نومسلم بھی شامل ہو گیا تو اس سے کیا بن بگڑ سکتا تھا!

تبلیغی پمفلٹ

سلامتی کا راستہ	۶/	ایک نہایت ہی اہم استفتاء	۲/
اسلام کا نظریۂ سیاسی	۶/	اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر	۶/
اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے	۶/	دین حق	۶/
انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل	۶/	نشان راہ	۶/
اسلام اور جاہلیت	۶/	جہاد فی سبیل اللہ	۶/
نیا نظام تعلیم	۶/	دستور جماعت اسلامی	۲/

انگریزی مطبوعات

(1) Towards Understanding Islam .. .. Rs 3/-

(2) What is Islam? .. .. Rs 1/8/-

مکتبہ جماعت اسلامی، دار الاسلام، پٹھان کوٹ (پنجاب)